ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۱۸

دوسرا سال: چھٹی کتاب

جون ۲۰۰۴ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

فون: 061-523486 / 0300-9638516

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: تیس روپے

زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ محمد عظمت اللہ خاں کی ایک قدیم اور لطیف نظم۔۔۔ — ڈاکٹر معین الرحمٰن — ۴

۳۔ فراق کی شاعری میں حسیاتی اور جمالیاتی فضا — ڈاکٹر نجیب جمال — ۸

۴۔ ادب اور معروضی حقیقت (جمالیات ۸) — ابنِ حسن — ۱۵

نوبل لیکچر:

۵۔ مدر ٹریسا — ترجمہ: نیر عباس زیدی — ۲۵

ڈرامہ:

۶۔ ایک عمر کئی زندگیاں — ڈاکٹر انوار احمد — ۳۳

افسانہ:

۷۔ کچرا — ڈاکٹر عقیلہ بشیر — ۵۵

۸۔ پھانس — لیاقت علی — ۶۰

انٹرویو:

۹۔ استاد شبیر خاں طبلہ نواز سے ایک مکالمہ — انٹرویو: احمد رضوان — ۶۷

ناول:

۱۰۔ ایک مرد (قسط ۱۰) — اوریانہ فلاشی / خالد سعید — ۷۵

غزلیات:

۱۱۔ احمد صغیر صدیقی (ایک غزل)، خاور اعجاز (تین غزلیں)، پرویز ساحر (چار غزلیں) نواز علی ندیم (چار غزلیں)، ظفر اقبال نادر (ایک غزل)، عطاء الرحمٰن قاضی (ایک غزل)، راؤ وحید اسد (ایک غزل)، اسلم سحاب ہاشمی (ایک غزل) — ۸۵-۹۲

نظمیں:

۱۲۔ احمد صغیر صدیقی (جب داستاں گو چپ ہوا)، ڈاکٹر علی اطہر (شب خون، نئے مقدر کا سورج، اچٹتی نیند کا نوحہ، مگر یہ کیسا عذاب دائم) — ۹۳-۹۶

سید عامر سہیل

چند باتیں

مجموعی سطح پر ہمارے یہاں برداشت کا کلچر ختم ہوجاتا رہا ہے، ہم زندگی کے مختلف شعبوں اور رویوں میں عدم برداشت کے قائل ہیں۔ اپنی بات کو درست سمجھنا اور اُسے حتمی، فیصلہ کن اور حقیقت پر مبنی قرار دے کر ہر مخالف رائے کو نا صرف ردّ کرنا بلکہ اُسے بری طرح کچلنے کی کوشش کرنا، مقتدر طبقوں سے لے کر نچلی سطح ہمارا مجموعی رویہ ہے۔ دہشت، جھنجھلاہٹ، غصہ، خوف ایسی بہت سی علامات ہمارے غیر منطقی اور جذباتی حوالوں کی علامات ہیں۔ ہمارے یہاں سوچ کا عمل بھی معکوس رہا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہم دلیل و منطق کی بجائے شدید ترین جذباتیت کا شکار ہوتے جارہے ہیں اور زندگی کے ہر معاملے خواہ وہ سیاسی، سماجی، مذہبی ہوں یا پھر علمی و ادبی میں کھولتے جذبات کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایشوز پر بات نہیں کرتے، تاریخی مغالطوں، مذہبی معاملات اور سیاسی پیچیدگیوں کا حل محض جوش سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ یقیناً منفی رجحان ہے۔ اِن پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کا حل اگر اَب بھی ممکن ہے تو صرف جذباتیت سے پاک برداشت کے کلچر کے فروغ اور مکالمے کی فضا کو زندہ کرنے میں مضمر ہے۔

مگر یہی مثبت رویے روبہ زوال ہیں۔ مکالمہ، جو کہ فرد سے لے کر معاشرے تک اور پھر اُس سے آگے بڑھ کر افکار و نظریات تک ایک ایسی زندہ روایت تھی جس میں سبھی کو احساسِ شرکت رہتا تھا۔ فرد کا معاشرے میں ہونے کا احساس، معاشرے کا دیگر معاشروں سے تعلق اور پھر مجموعی طور پر ترقی کرتا ہوا انسان ۔۔۔۔۔ مگر افسوس بالائی طبقوں، مقتدر قوتوں اور مفاد پرست عناصر کے لیے ایسا کلچر موت کے مترادف ہے۔ اَب بہت کچھ ہاتھ سے نکل چکا ہے اور بگاڑ کی کیفیت ناسور تک پہنچ چکی ہے تاہم تعمیر کی گنجائش اَب بھی موجود ہے۔ روشنی کی ایک کرن گھپ اندھیرے کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہے۔

اور روشنی کا یہ فروغ صرف اِسی صورت ممکن ہے کہ ہم ایک دوسرے کو برداشت کریں، دوسرے کی بات سنیں اور اپنی بات کو استدلالی اور منطقی بنائیں۔ شاید ہمارے بیچ نفرت کی کھڑی سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور لسانی دیواریں گر سکیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

کچھ خواجہ منظور حسین کے بارے میں، نیز:

محمد عظمت اللہ خاں کی ایک قدیم اور لطیف نظم

کا ابتدائی متن

(۱)

خواجہ منظور حسین (ولادت دہلی ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء، وفات: لاہور ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میگزین سے گہرا اور دُہرا تعلق رہا۔ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں اِس کے مدیر اور بہ زمانہ معلّی اس کے نگران رہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدّیقی نے بطور طالب علم علی گڑھ میگزین کی ادارت کو اپنا استحقاق جانتے ہوئے، اس اعزاز کو پانے کے لئے ایک موقع پر اپنی مہم جوئی کا ان لفظوں میں اظہار اور اعتراف کیا ہے:

> ’’۔۔۔۔ میں سمجھتا تھا کہ میگزین ایڈیٹر ہونے کے لئے ۔۔۔۔ میں نے مطلوبہ استحقاق حاصل کرلیا ہے، مگر ہوا یہ کہ ایک مرتبہ ۔۔۔۔ میرے ہم جماعت جاں نثار اختر (۱۹۱۴ء - ۱۹۷۶ء) میگزین کے ایڈیٹر مقرر کر دیئے گئے ۔۔۔۔ دوسرے سال میرے ایک ہم جماعت اور ہم پیالہ، ہم نوالہ دوست معین الدین دردائی (۱۹۱۳ء-۱۹۷۹ء) کو ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ اب میری طالب علمی کا ایک سال رہ گیا تھا۔۔۔۔ میں نے یہ طے کرلیا کہ اس مرتبہ آخری معرکہ لڑنا ہی پڑے گا۔
>
> میگزین کے نگران کوئی اُستاد ہوتے تھے۔ پچھلے دونوں موقعوں پر خواجہ منظور حسین صاحب میگزین کے نگران تھے۔ خواجہ صاحب ہمارے اُستاد تھے۔۔۔۔ معلوم نہیں خواجہ صاحب کیوں مجھے اِس منصب کے لئے پسند نہیں کرتے تھے۔۔۔۔ قصہ یہ تھا کہ علی گڑھ میں ترقی پسندوں کا ایک ٹولہ بن گیا تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جن کا جھکاؤ دین کی طرف تھا اور اُس زمانے کی اصطلاح میں وہ رجعت پسند تھا۔ اُن میں ہمارا بھی شمار تھا۔ شاید خواجہ صاحب کسی رجعت پسند کو ایڈیٹر بنانا نہیں چاہتے تھے۔
>
> اُس زمانے میں پروفیسر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم (وفات: کراچی ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء) علی گڑھ میں پرو وائس چانسلر تھے اور میگزین کے نگران کی سفارش پر فیصلہ وہی کرتے تھے۔ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا (اور) ایڈیٹر

مقرر ہو گیا ___ پہلا ردِّ عمل یہ ہوا کہ خواجہ صاحب نے میگزین کے نگران کے حیثیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اُستادِ محترم رشید احمد صدیقی اور بعض احباب مثلاً آل احمد سرور (وفات: دہلی ۹ فروری ۲۰۰۲ء) یہ سب کے سب (مجھ سے) بیک وقت ناراض ہو گئے۔''

(یہ سال ۳۶-۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے)۔ (روزنامہ جسارت، کراچی ۲۱ نومبر ۱۹۸۰ء)

ڈاکٹر لیث صاحب کے اس بیان کی جانب میرے توجہ دلانے پر، تحمل و تجمل اور کفایتِ لفظی پر مبنی مجھے خواجہ صاحب کا یہ جواب موصول ہوا:

''محبّی معین صاحب ___ لیث صاحب فرماتے ہیں: معلوم نہیں کیوں خواجہ صاحب مجھے اس منصب کے لئے پسند نہیں کرتے تھے اور اس ضمن میں اپنے ''دین کی طرف جھکاؤ'' کو (بھی) بیچ میں لاتے ہیں ___ ''ترقی پسند'' ہونے کی بنا پر میں اُن کا مخالف سہی، مگر رشید صاحب پر تو ''ترقی پسندی'' کی تہمت کبھی نہیں تھوپی گئی؟ پھر آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ وہ بھی اس منصب کے لئے لیث صاحب کے حق میں نہ تھے اور اُن کے تقرر پر خود اُن کے بقول ''ناراض'' ہوئے ___'' (خط، ۱۲ جنوری ۱۹۸۰ء)

میں نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب (ولادت: آگرہ ۱۵ جون ۱۹۱۶ء، وفات: کراچی ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء) سے پوچھا کہ میگزین کے نگران کا مرتبہ ٹیم کے کپتان یا کوچ کا سا ہوتا ہے ___ کوچ اور کیپٹن کسی وجہ سے (خواہ یہ وجہ کوئی بہت مستحکم بنیاد نہ بھی رکھتی ہو)، کسی کھلاڑی پر بھروسا نہیں کرتا، اُس کے عمومی رویوں سے مطمئن نہ ہو اور یہ گمان کرتا ہو کہ وہ ضروری ''ٹیم اسپرٹ'' نہیں رکھتا ___ ایسی صورت میں نگران کیا اُسے اپنی ٹیم میں لے لینے کا پابند ہے؟ یا اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے؟ ___ جبکہ مل جل کر ٹیم اسپرٹ کے ساتھ جان لگا کر کھیلنے والوں کا کال بھی نہ ہو؟

ڈاکٹر ابواللیث صدّیقی اپنی اہم علمی اور سماجی مصروفیات کے باعث میرے اس استفسار کا جواب دینے کے لئے کوئی لمحہ نہ نکال پائے ___ لیث صاحب اور خواجہ صاحب میرے لئے اُستاد الاساتذہ سے بھی بڑھ کر ہیں ___ بایں ہمہ میرا احساس یہ ہے کہ ایک ذمہ دار اور صاحب کردار رہنما کے طور پر خواجہ منظور حسین صاحب کا رویہ اور ردِّ عمل بالکل مناسب تھا کہ اُنہوں نے لیث صاحب کے لفظوں میں ''میگزین کے نگران کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا ___''

(۲)

خواجہ منظور حسین اپنی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میگزین کے ''مدیر'' رہے ___ یہ سال ۱۹۲۲ء-۱۹۲۴ء کی بات ہے ___ تب بھی ایک خاص طرزِ فکر رکھنے والے بزرگوں کی ایک منظّم مہم

کے نتیجے میں خواجہ صاحب کو میگزین کی ادارت سے سبکدوش ہونا پڑا تھا۔

علی گڑھ میگزین کے شمارہ ستمبر ۱۹۲۳ء میں جسے خواجہ صاحب نے ایڈٹ کیا تھا رشید احمد صدیقی کا ایک مضمون بہ عنوان ''فلسفہ ازدواج'' بعض طیب طبع رکھنے والوں پر گراں گزرا ___ اور میگزین کے اشاعتِ عام اور تقسیم و ترسیل سے پہلے اس چھپے ہوئے جزو کو میگزین سے خارج کرا دیا گیا ___ یہ عملی اقدام گویا مدیر کے اختیارِ تمیزی پر عدم اعتماد یا بے اعتباری کا مظہر تھا ___ خواجہ صاحب نے بجا طور پر فی الفور میگزین کی ادارت سے علاحدگی اختیار کر لی۔ ۲۰ فروری ۱۹۲۴ء کے ایک خط میں محمد عظمت اللہ خاں (ولادت: دہلی یکم جنوری ۱۸۸۷ء، وفات: مدن پلی مدراس ۱۱۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء) خواجہ منظور حسین کو لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ آپ ''علی گڑھ میگزین'' کی ادارت سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ آپ نے پرچے میں جان ڈال دی تھی ___ آپ کے صحیح ذوقِ ادبی سے قدامت پسند حلقہ بدکتا تھا۔ مجھے بالا بالا یہ۔۔۔ معلوم ہوا ہے کہ رشید احمد صاحب (صدیقی) کے مضمون میں کسی پروفیسر صاحب اور اُن کی نصف بہتر کی تلمیح آ پڑی تھی جس کی وجہ سے غالباً پرچہ ضبط ہوا اور شاید آپ نے اڈیٹری سے دست برداری کر لی۔۔۔۔''

میرے نام ۱۲ جنوری ۱۹۸۱ء کے ایک خط میں بعض دوسری باتوں کے علاوہ خواجہ منظور حسین صاحب نے لکھا ہے کہ:

''علی گڑھ میں تقسیم ہونے اور باہر بھیجے جانے سے پہلے (رشید احمد صدّیقی کا مضمون:) ''فلسفہ ازدواج'' (علی گڑھ) میگزین سے نکال دیا گیا تھا۔ مضمون سمیت رسالہ کسی کے ہاتھ لگ گیا اور اُس نے مضمون ''الناظر'' (لکھنؤ) میں چھپوا دیا ___ خود میں نے ''الناظر'' کا وہ پرچہ نہیں دیکھا۔''

میں نے خواجہ صاحب سے پوچھا تھا کہ:

''علی گڑھ میگزین اکتوبر نومبر ۱۹۲۳ء جس میں (رشید صاحب کا مضمون:) ''فلسفہ ازدواج'' شامل تھا کیا آپ کے پاس محفوظ ہے؟ یا کہیں اور آپ کے علم میں ہو؟ ___'' (خط، مورخہ ۹ نومبر ۱۹۸۰ء)

خواجہ صاحب نے کرم فرمایا اور مان بخشا:

''محبّی معین صاحب۔۔۔۔ آپ کو رشید صاحب کی کسی تحریر سے بھلا کیسے محروم رکھا جا سکتا ہے؟ یہ لیجئے اُن کا ''فلسفہ ازدواج''! (گرامی نامہ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۰ء)

علی گڑھ میگزین (مذکورہ) سے ''فلسفہ ازدواج'' پر مشتمل محذوف مطبوعہ صفحات ۵۱ تا ۶۶ میرے ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہیں۔ رشید احمد صدّیقی کا یہ حذف کردہ مضمون اُن کی کتاب ''میزانِ نثر'' کی

جلد اوّل (مطبوعہ کراچی اپریل ۱۹۹۹ء، مرتبین: مہر الٰہی ندیم اور لطیف الزماں خاں) میں شامل کر لیا گیا ہے اور اَب پڑھنے والوں کی دسترس میں ہے۔

علی گڑھ میگزین (مطبوعہ اکتوبر نومبر ۱۹۲۳ء) سے خارج/ضائع کئے گئے جزو کے صفحہ ۵۱ پر محمد عظمت اللہ خان کی ایک دلگداز شعری تخلیق ''من موہن پر روشنی آتما کے سورج کی'' درج ہے۔ اَسّی (۸۰) برس سے زیادہ پہلے کے چھپے ہوئے اس وجد آفریں شعری شاہکار کا عکس ''انگارے'' کے خوش ذوق قارئین کی نذر ہے۔

☆☆☆

من موہن پن روشنی آتما کے سورج کی

(نتیجۂ فکر محمد عظمت اللہ خاں صاحب دہلوی بی اے علیگ)

تری ناگن کی سای آنکھ، ترے بال کالے کالے
تری ستواں بانکی ناک، ترے ہونٹ امرت والے
اس میں موتی کی آب، یہ موج سے لہراتے
وہ حسن کی گویا جان، یہ جان کو گرماتے

وہ سلونا سانولا ترا رنگ، کندن کا سا
ترے ماتھے پر ایک تل، وہ حسن کا تارا زہرا
ماتھا چوڑا نور کا وہ، صبح کا سورج جیسے
سورج پر سے جس آن وہ پار گزرتا جائے

ترا جوبن گدرے آم، وہ بھری بھری مستی سی
وہ اثر دل پر برق سا، وہ کھچاؤ مقناطیسی
وہ پھٹا پڑنا جوش سے، وہ ابھار بے تابانہ
ہائے! یہ عالم دیکھ کر نہ ہو کون پھر دیوانہ؟

راگ کی سی لہراتی چال، وہ بیل سی بل کھاتی
کوئل کی سی آواز، اور وہ بھی لہراتی
سینہ پہ لوٹے سانپ سی، اک قیامت ڈھاتی
وجد میں لائی روح کو، اور دل کو برماتی

یہ جادو آواز کا، تری چال کی یہ بجلی
حسن یہ من کا کھیل ہے، من نہیں تو سب مٹی
تری صورت کی دل کشی، دلربائی سج دھج کی
من موہن پن روشنی آتما کے سورج کی

(علی گڈھ میگزین، اکتوبر نومبر ۱۹۲۳ء)

☆☆☆

ڈاکٹر نجیب جمال

فراق کی شاعری میں حسیاتی اور جمالیاتی فضا

یہ امر واقعہ ہے کہ اردو شاعری میں محبت کے حقیقی تجربے سے کہیں زیادہ حسن انسان کے دلکش جلوے اور سحر انگیز رعنائیاں ملتی ہیں گو حسن و عشق کی کشمکش نے بھی عجب سماں باندھے رکھا۔ آگ اور پانی کا یہ کھیل اپنی انتہاؤں کا ایک حیرت انگیز سلسلہ رکھتا ہے۔ یوں تو اردو شاعری میں تاریخی صداقتیں اور روزگار کی شدتیں بھی ہمیشہ موجود رہی ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ تخیلی صداقتوں اور خیال کی رعنائیوں کے تو انبار نظر آتے ہیں۔ شاعری یوں تو ہر زمانے میں دکھوں، محرومیوں اور حسرتوں کا نہ صرف شمار کرتی رہی بلکہ ان کا مداوا بھی ثابت ہوئی مگر اس کے ساتھ ہی یہ کبھی شاعری کو شعار کرنے والے محبوب تک پہنچنے کا ذریعہ بنی تو کبھی ایسا تیر ثابت ہوئی جو سیدھا دل میں ترازو ہو گیا۔ کبھی یہ اشاروں اور کنایوں کا بدل بنی تو کبھی استعاروں کے بھید کھول کر صاف صاف بات کرتی نظر آئی کبھی اس نے زیر نقاب بھی آئینے کے مقابل آرائش جمال کا نظارہ پیش کیا تو کبھی وصال کے بعد شباب کی دوشیزگی کو آئینہ کے روبرو کر دیا۔ شاعری میں انقلاب کی باتیں بھی ہوئیں اور آنچل کو پرچم بنانے کے مشورے بھی باہم ہوئے۔ دیوار زنداں پر اترتی شام کی تصویریں بنائی گئیں عالم نزع میں شکست رنگ کی آئینہ داری ہوئی، بگولوں، بیابانوں اور صحراؤں کے طول و عرض ناپے گئے اسیری اور رہائی کا مضمون باندھا گیا اور یہ سب کچھ ایک زمانہ بڑے شوق سے سنتا رہا اسی تناظر میں فراق کی مانوس مگر قدرے مختلف شاعری طلوع ہوئی۔

شاعری کے موثرات میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ یہ اردگرد کی بدصورتیوں کے باوجود حسن کی مکمل حالتوں کا بیان کرتی ہے اور کچھ اس طرح احساس جمال کی صورت گری کرتی ہے کہ کائنات بھی رقص کرتی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے فراق کی شاعری کے حوالے سے شاید سب سے بنیادی بات یہی ہے۔ اردو غزل کو عظیم آفاقی شاعری کی بلندی تک پہنچانے کیلئے اور وہ بھی ایک ایسے وقت میں جب غزل کی ''تنگنائے'' کے خلاف مختلف آوازیں بلند ہو رہی تھیں یقیناً کسی ایسے شاعر کے فکر و تخیل اور تخلیقی اظہار کی ضرورت تھی جو زندگی کے حسی ادراکات اور حقیقی تجربات کو نہایت سہولت کے ساتھ شاعرانہ حسن عمل اور حسن خیال میں ڈھال سکے اردو شاعری کے لئے بالعموم اور اردو غزل کیلئے بالخصوص یہ کام فراق نے اس طرح کیا کہ ایک ایک تمنا، ایک ایک حسرت اور ایک ایک خواہش سے خواب و خیال کی سو سو صورتیں پیدا کیں اور اپنی اندرونی خلش، فشار، تڑپ، اضطراب اور سوز و تپش کو بہجت و اہتزاز کے مضمون میں بدل دیا فراق صاحب نے اگرچہ خود بھی اپنی شاعری کو عشقیہ شاعری کا عنوان دیا ہے اور کبھی جلی تو کبھی خفی لفظوں

میں یہ عندیہ بھی دیا ہے کہ ان کی شاعری لطیف اور رنگین جنسی اور رومانی جذبات کی حامل ہے تاہم ان کے خیال میں عشقیہ شاعری کے لئے محض عاشق ہونا یا محض شاعر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ شاعری میں جمالیاتی یا حسیاتی تحریکات کے ہم راہ شخصیت میں کلچر کی گھلاوٹ اور اس کے شعور کی تھرتھراہٹوں میں آفاقیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔فراق نے اس سلسلے میں بڑی دلچسپ بات کہی ہے کہ ''اگر میں اپنے آپ کو محض کسی پیکر حسن و جمال کا سچا اور پرخلوص عاشق سمجھوں تو میں ٹھکانے سے اپنی عزت نہیں کرسکوں گا لیکن اگر میں اپنے متعلق محسوس کرسکوں کہ مجھے کائنات کی گوناگوں حقیقتوں اور انسانی زندگی کے اہم پہلوؤں سے دلچسپی ہے ایسی دلچسپی جو محض میرے شعور کی نہیں بلکہ میرے وجدان کی گہرائیوں میں کارگر ہو تو البتہ میں احساس اہانت و احساس کمتری سے بچ سکوں گا۔جنسیت اگر اس وسیع آفاقی معیار سے ہم آہنگ ہو تب تو وہ ایک قابل قدر جذبہ ہے اور ایسی جنسیت کی تحریک سے قابل قدر عشقیہ شاعری جنم لے سکتی ہے۔'' اب یہ الگ بات ہے کہ فراق کی غزل میں جسے انہوں نے عشقیہ شاعری کا نام دیا ہے۔کائناتی شعور اسی نسبت سے دکھائی دیتا ہے جس نسبت سے ان کے خیال میں جنسیت کی تحریک قابل قدر عشقیہ شاعری بن سکتی ہے۔ کائنات میں زمین، آسمان، چاند، سورج، ستاروں، فضا، موسموں کی رنگینی، حیوانات و نباتات اور رنگارنگ مناظر قدرت کی رمزیت، مانوسیت، طہارت اور انسانی حیات سے ہم آہنگی کا احساس فراق کو بچپن سے ہی رہا (بحوالہ ''میری شاعری'') فراق کہتے ہیں کہ ان احساسات سے بوجھل شخصیت جب جنسی یا عشقیہ محرکات و تجربات سے دوچار ہوگی تو اس شخصیت کا عشق بڑا ہوگا کیوں کہ تہذیب و تمدن و شرافت اور انسانی ارتقا کے عناصر اس میں جگمگاتے اور تھرتھراتے ہوئے نظر آئیں گے اور اگر یہ شخصیت ایک شاعر کی شخصیت ہو تو اس کی عشقیہ شاعری میں یہ تمام عناصر اپنی جھلکیاں دکھائیں گے اور پرچھائیاں ڈالیں گے۔'' فراق کی شاعری کے مطالعے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جنس کو برائے جنس کبھی اہم نہیں جانا ہاں اگر کائنات کا خارجی شعور اور شخصیت کا داخلی احساس جنسی احساس میں جذب ہو جائے تو فراق کے خیال میں پرعظمت عشقیہ شاعری جنم لے سکتی ہے۔فراق کے سب سے بڑے سخن فہم اور طرف دار حسن عسکری رہے ہیں انہوں نے بھی فراق کی عشقیہ شاعری کی سب سے بڑی خوبی ان کے کائناتی شعور ہی کو قرار دیا تھا۔ان کے لفظوں میں ''فراق صاحب کے شعروں میں اکثر محبوب کے حسن کا بیان کائنات کی اصطلاحوں میں ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ جب وہ محبوب کے حسن کے متعلق سوچتے ہیں تو ساتھ ساتھ کائنات کا حسن بھی اس کے ہم دوش ہوتا ہے (بحوالہ ''فراق صاحب'' از جھلکیاں) حسن عسکری نے ایک اور راز کی بات بھی بتائی ہے اور وہ یہ کہ ''فراق کی عشقیہ شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا محرک ضرور عشق ہے مگر یہ شاعری صرف عشق نے نہیں بلکہ شاعر کے پورے شعور نے کی ہے۔فراق نے عشق کو شعور اور زندگی کے دوسرے تجربات سے الگ کر کے نہیں دیکھا بلکہ عشق کو پوری زندگی کے گردوپیش میں رکھ کر دیکھا ہے ان کے یہاں عشق بہت سے ذہنی تجربوں میں سے ایک تجربہ

ہے۔'' (بحوالہ فراق صاحب)

حسن عسکری نے فراق کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے جابجا اپنی کم مائیگی کا اظہار بھی کیا ہے ان کے خیال میں فراق کی شاعری کے تمام امکانات کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہے انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ چوں کہ فراق کے یہاں جذبہ اور خیال الگ الگ نہیں کئے جاسکتے اِس لئے ان کی شاعری میں تہ داری بڑھ گئی ہے۔ان کے عوامی سطح پر اپنے معاصرین سے قدرے کم مقبولیت کی بھی یہی وجہ ہے۔ فراق صاحب سے حسن عسکری کی عقیدت اور الفت نے ان سے یہ تک کہلوایا کہ ''آج اگر اُردو نظم ونثر میں کوئی چیز پڑھنے کے قابل لکھی جارہی ہے تو وہ فراق صاحب کی شاعری اور تنقید ہے باقی بس اللہ کا نام ہے۔'' تاہم حسن عسکری نے فراق صاحب کی شاعری پر جتنی بھی بحث کی ہے اس کے نتیجے میں انہوں نے یا تو فراق کے کائناتی شعور کو منفرد و یکتا قرار دیا ہے اور یا پھر فراق کے اس شعر کو حاصل بحث قرار دیا ہے کہ

یہ غم و نشاط کی بحث کیا کبھی دیکھ آ کے فراق کو
اسی زندگی کی تجھے قسم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے

یہاں بھی حسن عسکری نے فراق کی زندگی، کائنات اور خارج سے کمٹ منٹ کو ان کی شاعری کی اساس قرار دیا ہے۔ایک اور بات جو حسن عسکری کے تجزیے میں بہت اہم ہے یہ ہے کہ فراق نے پورے شعور کے ساتھ شاعری کی ہے ممکن ہے کہ حسن عسکری نے لفظ شعور کو حواس کے متبادل کے طور پر استعمال کیا ہو لیکن جو بات اب میں کہنا چاہتا ہوں وہ فراق کی شاعری کے حوالے سے بہت ضروری ہے اور وہ یہی ہے کہ فراق کی شاعری مکمل حواس کی شاعری ہے، مکمل خوب صورتی اور رعنائی احساس کی شاعری ہے عشق سے بھی زیادہ محبوب کے حسن و جمال کی تکمیل پذیر حالت کی شاعری ہے۔فوری طور پر فراق کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے جو اسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست — ترے جمال کی دو شیزگی نکھر آئی

تاہم شعر کے مضمون سے معاملے کی جس نزاکت کا پتہ چلتا ہے اس سے خود فراق کے طالع کی بیداری کا اندازہ نہیں ہوتا۔فراق کی شاعری بعض صورتوں میں ماورائے حواس کیفیتوں اور ان کے ارتعاش کی شاعری بھی دکھائی دیتی ہے۔جسمانی تقاضوں، خواہشوں اور انسانی احساسات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ اس میں روحانی تسکین اور تشفی کا مضمون بھی دکھائی دے جاتا ہے:

حسن سر تا پا تمنا عشق سر تا سر غرور — اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں
وہ نہ آئیں گے تو فراق ہمیں — کام ہی کیا ہے انتظار کریں
کس لئے کم نہیں ہے درد فراق — اب تو وہ دھیان سے اُتر بھی گئے
سرحد جذب واثر سے حسن جاناں دور ہے — عشق کی دنیا بھی شاید عشق کی دنیا نہیں
میں عدم اندر عدم ہوں میں جہاں اندر جہاں — ایک ہی دنیا ہو میری اے فراق ایسا نہیں

ہم سب حسن کے حوالے سے کی گئی شاید بہت سی تعریفوں کے بارے میں ہم خیال نہ ہوسکیں لیکن فراقؔ کی شاعری کے طالب علم ہونے کے ناتے اِس بات پر ضرور متفق ہو سکتے ہیں کہ ان کے یہاں حسن و جمال یا خوبصورتی و رعنائی کا تصور بدصورتی سے شدید نفرت کے طور پر پیدا ہوا۔ حسن اور وہ بھی حسن انساں کا مضمون فراقؔ صاحب کی تشویقات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ حسن و جمال کی فلسفیانہ تحسین سے قطع نظر حسن ان کے لئے ذہنی آسودگی کا سب سے بڑا وسیلہ ہے اور ایک ایسی کیفیت ہے جسے عقل اپنے تمام اندیشوں اور احساس اپنی تمام رنگینیوں اور لطافتوں کے ساتھ یکساں طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ تاہم فن کے حوالے سے حسن یا حسن آفرینی کا تصور ایک مخصوص معنویت رکھتا ہے۔ تمام فنون لطیفہ حسن آفرینی کرتے ہیں اور ذہنی آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں شاید اسی لئے حسن اور مسرت کو ہم معنی بھی سمجھا گیا ہے اور اس کے مقابل بدصورتی کو نہ صرف تکلیف دہ بلکہ تخیل کی ناکامی اور اظہار ذات کی ناقص شکل قرار دیا گیا ہے۔ کروچے نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ فن کار ذات کے مکمل اظہار کی جستجو کرتا ہے اور اس طرح حسن کی کامل حالت کو دریافت کرتا ہے۔ اس تناظر میں یہ انداز کرنا زیادہ مشکل نہیں ہونا چاہیے کہ فراق صاحب کا فن حسی ادراکات کے ساتھ ساتھ ان کے وجدان اور متخیلہ کے سبب سہ البعادی بن گیا ہے۔ ان کے تخلیقی عمل میں جہاں ان کے حواس کی بیداری کا حصہ ہے وہاں ان کے تخیلات اور تصورات نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے یوں ان کے جمالیاتی طرز احساس نے ایک وسیع تر تجربے کی شکل اختیار کر لی ہے جس میں بدصورتی کے بارے میں ان کے شدید احساس تنافر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور شاید ردِعمل کے طور پر حسن کے بارے میں ان کا رویہ زیادہ حریصانہ دکھائی دیتا ہے۔ حسن محبوب سے ان کی دلچسپی نے اُن سے سراپا کی دلکشی، چہرے کی خوب صورتی، بدن کی لہلہاوٹ اور آئینہ بندی اور رفتار کی شوخی کو پہلو بدل بدل کر بیان کروایا ہے اور اس پر مستزاد محبوب کی آواز اور خفگی کو کیفیت حسن کے طور پر محسوس کرنا فراق کی خاص پہچان ہے۔ کچھ ملے جلے اشعار دیکھیے۔

اِس سے محبت کی ترکیبیں یوں تو بتاتے رہتے تھے لوگ
کس سے پوچھوں کون بتائے اب وہ خفا ہے کیا ہوگا

یہ چھب یہ روپ یہ جوبن یہ سج یہ دھج یہ لہک
چمکتے تاروں کی کرنوں کی نرم نرم پھوار

یہ رسمساتے بدن کا اٹھان اور ابھار
فضا کے آئینے میں جیسے لہلہائے بہار

سکون نما خم ابرو پہ ادھ کھلی پلکیں
ہر اک نگاہ سے ایمن کی بجلیاں لپکیں

سکوت نیم شبی لہلہے بدن کا نکھار
کہ جیسے نیند کی وادی میں جاگتا سنسار

رس میں ڈوبا ہوا لہراتا بدن کیا کہنا
کروٹیں لیتی ہوئی صبح چمن کیا کہنا

جیسے لہرائے کوئی شعلہ کمر کی یہ لچک
سر بسر آتش سیال بدن کیا کہنا

ڈوبیے تو ڈوبتے ہی جایئے
ان سیہ آنکھوں کی اُف گہرائیاں

وہ مست ناز اُٹھاتا ہے قدم سو احتیاطوں سے
لبالب جام مئے چلتے ہوئے چھلکاتا جاتا ہے

اپنے محور سے زمیں رہ گئی ہٹتے ہٹتے اپنی یہ شوخی رفتار سنبھالو دیکھو

فراقؔ کی شاعری میں یادوں کی جمالیات کا بھی ایک بڑا حصہ ہے اس حوالے سے ان کی ایک غزل کے کچھ اشعار تو اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ فراقؔ کی اس غزل نے بیسویں صدی میں اُردو غزل کا رشتہ نہ صرف تہذیبی اقدار کے ساتھ قائم رکھا بلکہ اسے مضبوط بھی کیا۔ یہی وہ غزل ہے جو لطیف و کثیف جذبوں کے درمیان ایک حد فاصل کھینچتی ہے اور ایک روشن خیال فکر اور شرافت آمیز شائستہ اور مہذب لہجے کی مثال قائم کرتی ہے یہ پوری غزل اُردو شاعری کو عطا کیا گیا ایک ایسا بیش قیمت تحفہ ہے جس میں کیفیات کی تہہ داری کے علاوہ صوتیات کی بے پناہ رمزیت نے حسن کلام کو نئی زندگی اور غنائیت کو نئی لے عطا کی ہے اس غزل کے ذریعے فراق صاحب نے شعری معنویت کا رشتہ ماضی کی تہذیبی روایات سے استوار کیا ہے ان کی اس غزل میں جذبہ و خیال کی ایسی وحدت دکھائی دیتی ہے جو اُردو شاعری میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ غزل کے مضامین معاشرتی اطلاقات اور تہذیبی باطن کی رونمائی کے ذریعے اجتماعی لاشعور کو گونج عطا کرتے ہیں پوری غزل عکس حیات بھی ہے نقد حیات بھی اور تخلیق حیات بھی آیئے ان کی مذکورہ غزل دیکھتے ہیں:

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

بھول جاتے ہیں کسی کو مگر ایسا بھی نہیں
یاد کرتے ہیں کسی کو مگر اتنا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
ہائے اب مجھ سے تجھے رنجشِ بے جا بھی نہیں

فطرتِ حسن تو معلوم ہے تجھ کو ہم دم
چارہ ہی کیا ہے بجز صبر سو ہوتا بھی نہیں

بے خودی ہوش نما، ہوش بھی غفلت آرا
ان نگاہوں نے کہیں کا مجھ رکھا بھی نہیں

نگہ ناز کی نیت کا پتا بھی نہیں اور
دل دیوانہ کا معصوم ارادہ بھی نہیں

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا
اور دل ہجر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

ہم اسے منہ سے برا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
دوست تیرا ہے مگر آدمی اچھا بھی نہیں

غزل کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہر شعر میں دل مبتلا کے مصائب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور واردات محبت کے بعد کی صورت حال کی منظر کشی کی گئی ہے۔ بیشتر اشعار میں نیت شوق کے مقابل نیت حسن اور فطرت حسن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ایک ہی غزل میں عاشق اور محبوب کے کیریکٹر کا یوں ایک دوسرے کے روبرو اس قدر پرکاری اور ہشیاری سے کم ہی تذکرہ کیا گیا ہے۔ پوری غزل میں عاشق کا رویہ ایک نارمل انسان کا ہے جو ترک تعلقات کو ایک روزمرہ کا معاملہ سمجھتا ہے وہ اپنے اختیار اور بے اختیاری کی حدوں کو جانتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ترک محبت کے اثرات کو محسوس کر سکتا ہے وہ محبت میں رنجش بے جا کے لطف سے بھی آشنا ہے اور اس تعلق کے ٹوٹنے پر ملال میں مبتلا نظر آتا ہے۔

غالب نے ایسے ہی موقع کے لئے یہ بے پناہ شعر کہا تھا:

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذت آزار دیکھ کر

دوسری جانب حسن کی نیت کیا ہے؟ اس کے بھید کھلنا ابھی باقی ہیں یہ بھید فراق کی غزل میں بھی بھید ہی رہتا ہے جس کا نتیجہ بجز صبر کے کچھ اور نہیں۔

ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ فراقؔ کی شاعری میں یاد کا مضمون خصوصی معنویت رکھتا ہے۔ اُردو شاعری میں یہ مضمون یاد ماضی کی راکھ میں دبی چنگاریوں کو کریدنے کے لئے باندھا جاتا رہا ہے۔ غالب کی غزل مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے اور حسرت کی غزل، چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے کو تو اس سلسلے میں غیر معمولی شہرت ملی فراقؔ کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں معاملہ بندی کا مضمون اس طرح دکھائی نہیں دیتا جس کی وجہ سے مصحفی، میر حسن، آتش، مومن اور پھر حسرت کی پہچان ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ فراقؔ عشق کی نفسیات کا شاعر تو ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ حسن کا نبض شناس بھی ہے۔ اس لئے وہ عشق کو بھی واردات یا تجربے سے زیادہ کیفیت کے طور پر بیان کرتا ہے ان کے عشقیہ اشعار میں دل مبتلا کی آزمائشوں کا تذکرہ بھی کیف عشق کے حوالے سے ہے مگر امر واقعہ میں عاشق ایک ہوش مند اور نارمل انسان ہے جو حسن کو سمجھنا چاہتا ہے۔ فطرت حسن کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے۔ فراقؔ کا رویہ تو عاشق کے بارے میں بھی بہت حد تک تحلیل نفسی کا سا ہے وہ تو عاشق کے کردار اور اس کی نیت عمل کو بھی پرکھنا چاہتا ہے۔ دل ہجر نصیب کی شکیبائی کو محسوس کرنا چاہتا ہے اور ان سب محسوسات اور کیفیات کی تہ در تہ حالتوں کو سمیٹ کر بیان کرنا چاہتا ہے جو یادوں کی صورت کبھی ٹیس بن کر تو کبھی کسک بن کر زندہ رہتی ہیں۔ بیانِ حسن کے سہارے وہ محرومی، نارسائی اور مجبوری کا مداوا بھی کرتا ہے اور زندگی کو قابل رشک نہ سہی مگر گوارا بناتا ہے احباب کی تصوراتی محفل سجاتا ہے، نشاط کے رنگوں سے غم کی تصویر بناتا ہے غزل کا ساز اُٹھاتا ہے بزم کو وجد میں لاتا ہے گزرے زمانوں کے پسِ منظر میں مسکراہٹوں کے دیپ جلاتا ہے تبسم کی لکیریں کھینچتا ہے پچھلی رات کو نیند میں ڈوبے ہوئے چراغوں کی لو میں دل کے داغوں کا شمار کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر عمر بھر کی بھولی بسری کہانیوں کو شعر کے کینوس پر مصور کرتا ہے دیکھیے:

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

رنگا رنگ نشاط سے یارو غم کی اک تصویر بناؤ

وجد میں لاؤ بزم سخن کو یارو غزل کے ساز اُٹھاؤ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی کہ جگمگا اُٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

دلوں میں داغ محبت کا اب یہ عالم ہے کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

جن کو ہم اک عمر تک بھولے رہے آج وہ باتیں بہت یاد آئیاں

اِس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ فن کی تمام صورتیں ذہنی آسودگی پیدا کرتی ہیں، ہمارے ذوق جمال کی

تسکین کرتی ہیں اور ہمارے شعور حیات میں اضافہ کرتی ہیں۔ شاعری بلاشبہ تمام فنون لطیفہ سے زیادہ موثر تحریکات کی حامل ہے۔ فراقؔ کی شاعری کو دیکھا جائے تو یہ اپنی مجموعی حیثیت میں حسن آفرینی کرتی نظر آتی ہے جس کے نتیجے میں مسرت و بہجت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے یہ وہ مسرت ہے جو صفات حسی کی ارفع حالت کے بیان سے جنم لیتی ہے۔ کانٹ نے کہا تھا کہ حسن دراصل عقل اور احساس کے متناسب تعامل سے پیدا ہوتا ہے۔ فراقؔ صاحب کے ہاں حسن اور مسرت دونوں اسی متناسب تعامل ہی سے وجود میں آتے ہیں اور دونوں ہی معنی خیز ہیں اور ان کی یافت حسی ادراکات کے ساتھ ساتھ شعور کو بھی اپیل کرتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ فراقؔ صاحب کا ادراک تخیل کی برجستگی کے سبب زیادہ فعال دکھائی دیتا ہے۔ یوں ان کے حسی اور لمسیاتی حوالے محض ان کی طاقت ور متخیلہ کے سبب معنی خیز اور مربوط تجربات معلوم ہونے لگتے ہیں۔

حسن کے بارے میں ایک نظریہ یہ بھی رہا ہے کہ حسن بیش تر روابط جنسی کے لطف میں پایا جاتا ہے۔ اُردو شاعری کے حوالے سے بات کریں تو اس تصور میں اور بھی زیادہ سچائی نظر آتی ہے۔ ہماری اُردو شاعری میں تو اس تعلق کو استوار کرنے کے لئے عجز و نیاز کے بعد دامن کو حریفانہ کھینچنے کی کاوش بھی دکھائی دیتی ہے۔ وجہ اس کی یہ رہی کہ فن کار یا شاعر کے جبلی تقاضے ایک عام آدمی کی نسبت زیادہ شدید ہو سکتے ہیں اس کے بہت سے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زندگی میں کوئی نہ کوئی محرومی نفس کی گہرائیوں میں گھس کر بیٹھ جاتی ہے اور پھر گاہے گاہے کسی نہ کسی جسمانی تقاضے سے تقویت پا کر کبھی خار حسرت کی صورت اور کبھی دل کا کانٹا بن کر زبان سے ادا ہو جاتی ہے اس طرح شاعر کے اندرونی ہیجان کو مربوط اظہار کا ایک موقع ملتا ہے۔ اب یہ منحصر ہے کہ شاعر کون ہے اس کا تخلیقی اظہار کس سطح کا ہے اس کے جذبوں کی تہذیب کس درجہ پر ہوئی ہے اور وہ اپنے احساس کو خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے کس حد تک مسرت آفرینی کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ بقول کروچے ''صحیح جمالیاتی لذت دوسری لذتوں کے مقابلے میں وہ مخصوص لذت ہے جس سے فن کار پہلے پہل اپنے وجدان میں تخلیق کے وقت متکیف ہوتا ہے۔'' اُردو میں فراق کی شاعری اس عمل کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ان کی شاعری میں حسن کو سمجھنے، جاننے، چھونے اور وصل کی خواہش نے ایک پرکیف حسیاتی اور جمالیاتی فضا کو ہمارے ادراک کی سطح پر زندہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ فراق لمس کے فرحت آگیں احساس ہی سے لطف حاصل کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حسن پر تصرف حاصل کرنے کی خواہش اس کی اگلی منزل ہے تاہم حقیقی زندگی میں اس کا نامرادانہ احساس ردعمل کی صورت فراق کے تخلیقی اظہار کو بامراد کر گیا ہے۔

☆☆☆

ابن حسن

جمالیات(۸)

ادب اور معروضی حقیقت

ترجمہ: نیر عباس زیدی

مدر ٹریسا

مدر ٹریسا، مختصر تعارف

مدر ٹریسا ۲۷ اگست ۱۹۱۰ء کو میسوڈونیا میں پیدا ہوئیں۔ ان کا خاندان البانوی نژاد تھا۔ بارہ سال کی عمر میں انہیں خدائی احکامات کی طرف لگاؤ ہونے لگا۔ انہیں معلوم تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات پھیلانے کے لئے ایک راہبہ بننا ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اپنا آبائی گھر چھوڑ کر آئرلینڈ سے تعلق رکھنے والی راہباؤں کی اُس جماعت میں شمولیت اختیار کی جس نے ہندوستان میں اپنے مشن کی تکمیل کرنا تھی۔ ڈبلن (آئرلینڈ) میں چند ماہ کی ٹریننگ کے بعد انہیں ہندوستان بھیج دیا گیا جہاں ۱۹۳۱ء میں انہوں نے ایک نن کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۸ء تک انہوں نے سینٹ میری ہائی سکول کلکتہ میں تدریس کا کام سرانجام دیا، لیکن انہوں نے جس غربت وافلاس، دُکھ تکلیف کا مشاہدہ کونوینٹ کی عمارت سے باہر کیا اس کا اثر اتنا گہرا ہوا کہ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے حکام بالا سے اجازت لے کر سکول میں تدریس کے کام کو خیر باد کہا اور خود کلکتہ کے پسماندہ علاقوں میں موجود مفلس لوگوں کی فلاح کے لئے کام شروع کر دیا۔ ان کے پاس فنڈ نہیں تھے لہٰذا خدائی امداد پر بھروسہ کرتے ہوئے غریب بچوں کے لئے کھلے آسمان تلے ایک سکول کھول لیا۔ جلد ہی رضا کارانہ خدمات سرانجام دینے والے افراد ان کے مشن میں شامل ہو گئے اور مالی امداد بھی حاصل ہوگئی، یوں ان کے کام کا دائرہ وسیع ہونا شروع ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۵۰ء میں انہیں پوپ نے اجازت دی کہ وہ اپنا فلاحی ادارہ ''دامشنریز آف چیریٹی'' کے نام سے شروع کر دیں۔ اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد معاشرے کے ان افراد کی دیکھ بھال تھا جن کی خبر لینے والا کوئی نہیں۔ پوپ پال ہشتم کی سند سے یہ ادارہ بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا۔ آج اس ادارے کی دنیا کے کئی ممالک میں شاخیں موجود ہیں۔ اس ادارے میں مراقبہ کرنے والے راہب اور عملی طور پر انسانیت کی خدمت کرنے والی سسٹرز کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ ۱۹۸۴ء میں پادریوں کی ایک شاخ کا بھی اس میں اضافہ کیا گیا۔ اسی ادارے کی شاخیں اب روس اور مشرقی یورپ کے ممالک سمیت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ ادارہ ایشیا کے بے شمار ممالک سمیت افریقہ اور لاطینی امریکہ میں غریب و مفلس افراد کو امداد مہیا کر رہا ہے۔ سیلاب، قحط اور وبا کی صورت میں متاثرہ افراد کی امداد بھی اسی ادارے کی بے شمار ذمے داریوں میں سے ایک ہے۔ اسی ادارے کے شمالی امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا میں بھی مراکز ہیں جہاں یہ نشئی، بے گھر افراد اور ایڈز کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء تک اس فلاحی ادارے کے مراکز تقریباً چالیس ممالک میں مصروفِ خدمت ہیں اور ان میں کام کرنے والے افراد کی

تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان امدادی کارکنوں سمیت یہ مبلغین اپنی روزمرّہ کی زندگی اور اپنے معمولات میں مدر ٹریسا کے سے جذبہ خدمت کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مدر ٹریسا کی خدمات کو پوری دنیا میں سراہا گیا ہے اور انہیں بے شمار اعزازات وانعامات سے نوازا گیا ہے جس میں پوپ جان انعام برائے امن ۱۹۷۱ء، نہرو ایوارڈ برائے عالمی امن ۱۹۷۲ء، بالزن ایوارڈ ۱۹۷۹ء، ٹیمپلیٹن اور میگسیسے ایوارڈ شامل ہیں۔ انہیں نوبل انعام برائے امن ۱۹۷۹ء سے بھی نوازا گیا۔ مدر ٹریسا ۵ ستمبر ۱۹۹۷ء کو وفات پا گئیں۔

نوبل خطبہ برائے امن ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۹ء

ہم سب لوگ یہاں نوبل انعام برائے امن ملنے پر خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں، لہٰذا میرے خیال میں یہ شاندار رہے گا اگر ہم اسیسی کے سینٹ فرانسس کی دعا پڑھیں، اس دعا نے مجھے ہمیشہ حیرت میں ڈالے رکھا۔ ہم لوگ اس دُعا کو روزمرّہ عشائے ربّانی کے بعد پڑھتے ہیں کیونکہ یہ ہر ہر شخص کے لئے موزوں اور بہتر ہے۔ میں اس بات پر بھی حیران ہوں کہ اسیسی کے سینٹ فرانسس نے چار پانچ سو سال قبل جب اس دُعا کو ترتیب دیا تو ان کی بھی وہی مشکلات تھیں جو آج ہمیں درپیش ہیں۔ لہٰذا ہم سب مل کر یہ دعا پڑھیں گے۔۔۔

آئیں سب مل کر خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں آج یہاں اکٹھے ہونے کا موقعہ فراہم کیا۔ اس امن کی نعمت کا شکریہ جو ہمیں باور کراتی ہے کہ ہم لوگ اسی امن میں رہنے کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں اور یسوع ایک بشر کی شکل میں اس پیغام کو لے کر عام انسان تک پہنچانے آئے۔ وہ سوائے گناہ کے ہماری ہی طرح کے انسان بن کر آئے اور انہوں نے اعلامیہ جاری کیا کہ وہ خوشخبری لے کر آئے ہیں۔ دائمی امن کی اور یہ ایسی چیز ہے جس کی ہمیں خواہش ہے، سکون قلب کی۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا سے اتنا پیار کرتا ہے کہ اس نے اپنا بیٹا دنیا کو دے ڈالا۔ اُس نے دنیا کی محبت میں اپنا بیٹا دیا اور اسے کنواری مریمؑ کے ہاں پیدا کیا اور حضرت مریمؑ جیسے ہی حاملہ ہوئیں وہ فوراً اپنے چچازاد بھائی کے گھر یہ خوشخبری دینے گئیں، اس بچے کی خوشخبری جو ابھی رحم مادر میں تھا، ان کے چچازاد خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ یہ بچہ امن کا پہلا پیغامبر ہے، انہیں امن کے شہزادے کی آمد کا ادراک ہو گیا، وہ بولے اللہ نے عیسیٰؑ کی شکل میں میرے اور تمہارے لئے خوشخبری بھیجی ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں تھا۔ وہ اس عظیم محبت کی خاطر مصلوب بھی ہوئے۔ انہوں نے تمہاری میری خاطر جان دی، اس کوڑھی شخص کی خاطر، اس بھوکے کی خاطر، اس برہنہ شخص کی خاطر جو نہ صرف کلکتہ کی گلیوں میں ہے بلکہ افریقہ، نیویارک، لندن اور اوسلو میں بھی ہے۔ یسوع نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں جیسے وہ خود ہم سے محبت کرتا ہے۔ نئے عہدنامے میں ہم بڑی وضاحت سے پڑھتے ہیں۔ محبت کرو جیسی میں نے تم سے کی۔ جیسی مقدس باپ مجھ

سے کرتا ہے۔ ویسی ہی محبت میں تم سے کرتا ہوں۔ مقدس باپ جتنی محبت مجھ سے کرتا ہے اتنی ہی اس نے ہمیں عطا کی، اتنی ہی محبت ہمیں ایک دوسرے سے کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ ہمیں خود اس محبت کے دینے میں زحمت و تکلیف اُٹھانی پڑے۔ ہمارا یہ کہنا کافی نہیں کہ میں خدا سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اپنے پڑوسی سے محبت نہیں کرتا۔ سینٹ جونز کہتا ہے کہ تم دروغ گوئی سے کام لیتے ہو اگر تم یہ کہتے ہو کہ میں اپنے خدا سے محبت کرتا ہوں اور اپنے پڑوسی سے محبت نہیں کرتا۔ تم اپنے خدا سے کس طرح محبت کر سکتے ہو جسے تم نے دیکھا ہی نہیں اگر تم اپنے پڑوسی سے محبت نہیں کرتے جسے تم دیکھتے ہو، چھوتے ہو اور جس کے ساتھ تم رہتے ہو۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ حقیقی محبت کرنا تکلیف کا باعث ہے۔ یسوع نے ہم سے محبت کر کے تکلیف اُٹھائی، یقیناً انہیں بہت تکلیف اُٹھانا پڑی۔ انہوں نے ہماری بھوک مٹانے کے لئے خود کو ہماری زندگیوں اور روحوں کی خوراک بنا ڈالا، خدا کی محبت کی بھوک کے لئے، کیونکہ ہم اسی محبت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم انہی کے عکس پر خلق کئے گئے ہیں۔ ہمیں محبت کرنے اور کئے جانے کے لئے خلق کیا گیا ہے اور پھر وہ انسان کے روپ میں آئے تا کہ ہمارے لئے یہ ممکن ہو کہ ہم محبت کریں جس طرح وہ ہم سے محبت کرتا ہے پھر وہ ایک بھوکے کی صورت، ایک برہنہ کی صورت، ایک بے گھر کے روپ میں، ایک بیمار کی شکل میں ایک قیدی، تنہا شخص اور ناپسندیدہ فرد کی صورت ہمارے سامنے آیا اور وہ کہتا ہے کہ تم نے ان سے اچھا سلوک نہیں کیا گویا یہ سلوک تم نے مجھ سے کیا۔ کوئی شخص ہماری محبت کا بھوکا ہے، کسی کو غربت کی بھوک ہے اسی بھوک کو مجھے اور آپ نے مل کر تلاش کرنا ہے۔ یہ بھوک ہمارے گھر میں بھی ہو سکتی ہے۔

میں کبھی بھی اس واقعے کو فراموش نہیں کر سکتی جب میں ایک ایسے مرکز میں گئی جہاں کئی بیٹے اور بیٹیوں نے اپنے والدین کو چھوڑ دیا تھا اور شائد انہیں بھول بھی گئے تھے۔ میں وہاں گئی اور دیکھا کہ اس مرکز میں ان لوگوں کی سہولیات کی تمام اشیاء تھیں لیکن ان میں سے ہر شخص دروازے کی طرف تک رہا تھا اور کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ میں نے وہاں پر موجود سسٹر سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟ ان لوگوں کو تمام سہولیات میسر ہیں پھر بھی یہ لوگ دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں، یہ لوگ مسکرا کیوں نہیں رہے؟ میں تو اپنے مرکز میں موجود تمام لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھنے کی عادی ہوں، قریب المرگ شخص بھی مسکراتا ہے۔ اس سسٹر نے جواب دیا: ایسا ہر روز ہوتا ہے۔ انہیں روزانہ یہ امید ہوتی ہے کہ ان کا کوئی بیٹا یا بیٹی ان سے ملاقات کرنے آئیں گے اور انہیں اس بات کا رنج ہوتا ہے کہ ان کی اولاد نے انہیں فراموش کر دیا ہے۔ یہ اسی طرف دیکھ رہے ہیں جہاں سے محبت کرنے والے لوگ داخل ہوتے ہیں۔ یہی غربت ہمارے لوگوں میں آسکتی ہے، محبت سے فراموشی۔ ہمارے ہی خاندان میں سے کوئی ہو سکتا ہے جو تنہائی محسوس کر رہا ہو، جو بیمار ہو، پریشان ہو، اس قسم کے ایّام ہر شخص کے لئے مشکل کا باعث ہوتے ہیں۔ کیا ہم اس جگہ موجود ہیں جہاں ان کا استقبال کیا جا سکے، کیا بچے کے استقبال کے لئے ماں موجود ہے؟

مغرب کی دنیا میں یہ بات میرے لئے باعث حیرت ہے کہ بہت سے جوان لڑکے اور لڑکیاں نشے کے عادی ہیں، میں نے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی، تو اس کا جواب یہ ملا: ان کے خاندانوں میں کوئی ایسا فرد نہیں جو روز ان کا استقبال کرے۔ ان کے والدین اتنے مصروف ہیں کہ ان کے پاس وقت ہی نہیں۔ والدین کسی دفتر میں مصروف ہیں اور بچہ اِدھر اُدھر نکل جاتا ہے اور کسی بری عادت کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہم امن کی بات کرتے ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں جو امن کو تباہ کرتی ہیں لیکن میرے خیال میں امن کا سب سے بڑا دشمن اسقاطِ حمل ہے، یہ ایک بلاواسطہ جنگ کا نام ہے بلاواسطہ قتل، ماں کا (اپنے ہونے والے بچے کو) خود قتل کر دینا۔ ہم کتابِ مقدس میں پڑھتے ہیں: کوئی ماں تو اپنی اولاد سے غفلت برت سکتی ہے، لیکن میں تم سے غفلت نہیں برت سکتا۔ میں نے تمہیں اپنے ہاتھ سے تراشا ہے ہم خداوند کے ہاتھ سے تراشے گئے ہیں، اس کے انتہائی قریب ہیں اور یہی بات مجھ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی جملے کا آغاز کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ماں اپنی اولاد سے غفلت برتے، وہ تو برت سکتی ہے لیکن میں تم سے کبھی غافل نہیں۔ آج کے اس دور میں امن کی تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ اسقاطِ حمل ہے اور ہم سب لوگ جو یہاں موجود ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے والدین نے چاہا کہ ہم اس دنیا میں آئیں۔ ہم بھی اس دنیا میں موجود نہ ہوتے اگر ہمارے والدین بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتے۔

جہاں تک ہمارے بچوں کا تعلق ہے ہم انہیں چاہتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں لیکن ان لاکھوں بچوں سے متعلق کیا خیال ہے جو شائد ناقص غذا اور بھوک کی وجہ سے وفات پا جاتے ہیں، اسی طرح ہزاروں بچے ماؤں کی رضامندی سے دیدہ دانستہ مار دیئے جاتے ہیں اور یہی (اسقاطِ حمل) آج دنیا کے امن کو تباہ کئے دے رہا ہے کیونکہ اگر کوئی ماں خود اپنے بچے کو قتل کر سکتی ہے تو پھر میرے یا آپ کے لئے قتل کرنے کے لئے کیا باقی رہا۔ یقیناً کچھ نہیں۔

میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ہر علاقے کے افراد سے اپیل کروں گی کہ بچے کو اس دنیا میں آنے دیں، ہر سال بچوں کا سال ہے، ہم نے بچوں کے لئے کیا کیا؟ آیئے اور اس سال کو ایسا سال بنا دیں کہ ہم ہر بچے کو پیدا ہونے دیں۔ سال کا اختتام ہوا چاہتا ہے کیا ہم نے بچوں کو اس دنیا میں آنے کے لئے پسندیدہ قرار دیا؟ میں آپ کو کچھ حیران کن چیزیں بتانا چاہتی ہوں۔ ہم اسقاطِ حمل جیسی بھیانک چیز کا مقابلہ بچوں کے گود لینے سے کر رہے ہیں۔ ہم نے ہزاروں بچوں کو بچایا، ہم نے تمام کلینک، ہسپتالوں، پولیس سٹیشنوں کو ہدایات بھیج دی ہیں: برائے مہربانی بچوں کو ضائع مت کریں، ہم بچے کو پرورش کے لئے لے لیں گے۔ لہٰذا شب و روز کوئی نہ کوئی انہیں یہ سمجھاتا رہتا ہے کہ ہم تمہارے بچے کی دیکھ بھال کریں گے اور ہم اس بچے کو رہنے کی جگہ فراہم کریں گے۔ ہم لوگوں کے پاس بے اولاد جوڑوں کی بے شمار فرمائشیں ہیں۔ یہ ہمارے لئے نعمت سے کم نہیں اور ہم ایک اور بہترین کام سرانجام دے رہے ہیں۔ ہم فقیروں کوڑھیوں، کچی آبادی کے مسکینوں اور بے گھر افراد کو فطری خاندانی منصوبہ بندی سکھا رہے ہیں۔

گزشتہ چھ سالوں میں صرف کلکتہ ہی میں ہم نے فطری منصوبہ اور ضبطِ نفس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے شرح پیدائش کو کم کیا۔ ہم نے انہیں درجہ حرارت کے اثرات سمجھائے، جو بہت سادہ اور خوبصورت ہیں، وہ لوگ انہیں سمجھ گئے۔ معلوم ہے انہوں نے مجھے کیا بتایا؟ ___ ہمارا خاندان صحت مند ہے، متحد ہے اور ہم اپنی مرضی کے مطابق بچے کی پیدائش میں وقفہ ڈال سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات عیاں ہے کہ گلیوں کے رہنے والے یہ لوگ جب اس پر عمل پیرا ہو سکتے تو ان کے علاوہ دیگر افراد بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ بغیر اس زندگی کو ضائع کئے جسے اللہ نے تخلیق کر دیا۔

غریب لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں بے شمار خوبصورت چیزیں سکھا سکتے ہیں۔ ان افراد میں سے ایک میرا شکریہ ادا کرنے آئے اور کہا: تم لوگ جنہوں نے پاکدامنی کا عہد کر رکھا ہے تم لوگ بے مثال ہو کہ تم نے ہمیں خاندانی منصوبہ بندی سکھائی کیونکہ یہ محض ضبطِ نفس کا نام ہے اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہ ایک انشائی خوبصورت جملہ کہا۔

ایک شام ہم شہر میں نکلے اور ہم نے کچی آبادی سے چار افراد کو علاج کی غرض سے اُٹھایا۔ ان میں سے ایک کی حالت بڑی تشویش ناک تھی۔ میں نے سسٹرز کو باقی تین کی دیکھ بھال کرنے کا کہا اور خود اس کی دیکھ بھال کی جس کی حالت خراب تھی۔ میں نے اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق اس کی خدمت کی۔ اسے بستر پر لٹایا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی، اس نے میرا ہاتھ تھاما اور صرف ایک لفظ بول سکی: شکریہ۔ اور وہ وفات پا گئی۔ میں اس کے سامنے اپنے ضمیر کا جائزہ لئے بغیر نہ رہ سکی اور کہنے لگی کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو کیا کہتی۔ میرا جواب سادہ تھا۔ میں اپنی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتی، میں یہ کہتی کہ میں بھوکی ہوں، میں مر رہی ہوں، مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے، مجھے تکلیف ہو رہی ہے یا کچھ اور لیکن اس نے یہ سب کچھ نہیں کہا، اس نے مجھے اپنی شاندار محبت دی اور وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لئے وفات پا گئی۔

ایک اور شخص جسے ہم نے نالے سے نکالا تھا، اس کا جسم کیڑے کھا رہے تھے، ہم اسے اُٹھا کر اپنے ادارے میں لائے، وہ بولا: میں جانوروں جیسی موت مرنے والا تھا، لیکن اب میں فرشتوں جیسی موت مروں گا جس میں محبت اور دیکھ بھال شامل ہے۔ ہمیں اس شخص کی عظمت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، وہ نہ تو کسی کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا، نہ کسی کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور نہ ہی کسی سے موازنہ کر رہا تھا۔ یہ ہی ہمارے لوگوں کی عظمت ہے اور اسی لئے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یسوع نے فرمایا: میں بھوکا تھا، میں برہنہ تھا، میں بے گھر تھا، بے آسرا تھا، محبت کے لئے ترسا ہوا تھا، میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا، تم نے ان لوگوں سے اچھا سلوک کیا، گویا تم نے یہ سلوک مجھ سے کیا۔

میں سمجھتی ہوں کہ ہم لوگ ظاہری طور پر تو سماجی کام سرانجام دے رہے ہیں لیکن حقیقتاً ہم وہ لوگ ہیں جو چوبیس گھنٹے یسوع کے جسم کو چھو رہے ہیں۔ ہم ہمہ وقت ان کے سامنے حاضر ہیں۔ آپ لوگ

بھی اس موجودگی کو اپنے خاندان میں لانے کی کوشش کریں کیونکہ جو خاندان اکٹھے عبادت کرتا ہے وہ اکٹھے ہی رہتا ہے، ہمارے خاندانوں میں امن پیدا کرنے کے لئے بم اور رائفل کی ضرورت نہیں، صرف اکٹھے ہو جائیں، ایک دوسرے سے محبت کریں، اس امن کو پیدا کریں، اس خوشی کو، گھر میں افراد کی موجودگی کی قوت کو، تو ہم اِس قابل ہو جائیں گے کہ برائی پر قابو پا لیں۔

اس دنیا میں اس قدر کرب، آلام، نفرت، غربت و افلاس موجود ہے، ہم اپنی عبادات سے اپنی قربانیوں سے، اپنے گھر سے محبت کی ابتداء کریں۔ محبت کا آغاز گھر سے ہوتا ہے۔ محبت وہ نہیں جو ہم زبان سے بیان کرتے ہیں بلکہ محبت وہ ہے جتنی ہم عمل میں لاتے ہیں، خدا سے محبت کا اظہار بھی اسی طرح ممکن ہے محبت وہی ہے جو ہم مخلوق خدا کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے کلکتہ میں چینی کی کمی واقع ہوئی، مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات بچوں تک کیسے پہنچ گئی، ایک چار سالہ بچہ، جس کا تعلق ہندو خاندان سے تھا، اپنے والدین سے بولا: میں تین روز تک چینی نہیں کھاؤں گا، میں اپنے حصے کی چینی مدر ٹریسا کو دوں گا تا کہ وہ اپنے مرکز کے بچوں کو کھلا سکے۔ تین دن بعد اس کے والدین اس بچے کو میرے پاس لے آئے۔ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی اور وہ معصوم بچہ بمشکل میرا نام پکار سکتا تھا لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ وہ یہاں اپنی محبت بانٹنے آیا ہے۔ مجھے اسی طرح کی محبت آپ لوگوں سے ملی، میں جب سے یہاں آئی مجھے حقیقی محبت میسر آئی، ایک دوسرے کو سمجھنے والی محبت، ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستان کا ہر فرد، افریقہ کا ہر فرد آپ لوگوں کے لئے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ میں اپنے گھر کا سا سکون محسوس کر رہی ہوں۔ میں آج سسٹر کو بتا رہی تھی کہ مجھے اس شہر کی کونوینٹ میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ کلکتہ کی سسٹرز ہوں، بالکل گھر کا سا ماحول۔

اب میں آپ لوگوں سے کہوں گی کہ آپ بھی غریب لوگوں کو تلاش کریں، پہلے اپنے گھر سے محبت کا آغاز کریں، اپنے لوگوں کو خوشخبری سنائیں، پھر اپنے پڑوسیوں کے بارے میں معلوم کریں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں؟ مجھے ایک ہندو خاندان سے بڑا عجیب تجربہ ہوا۔ ان والدین کے ہاں آٹھ بچے تھے۔ ایک شخص ہمارے مرکز میں آیا اور اس نے مجھے اس خاندان کے بارے میں بتایا کہ ایسا خاندان ہے جن کے آٹھ بچوں نے کئی روز سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ ان کے بارے میں کچھ کریں۔ لہٰذا میں نے تھوڑے سے چاول لئے اور فوراً وہاں چلی گئی۔ ان بچوں کو دیکھا جن کی آنکھوں اور چہرے سے بھوک جھلک رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ لوگوں نے بھی بھوک دیکھی ہے۔ میں نے بھوک کو قریب سے دیکھا ہے۔ اس خاتون نے مجھ سے چاول لئے، اپنے بچوں میں تھوڑے سے چاول تقسیم کرنے کے بعد وہ باہر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو میں نے پوچھا کہ تم کہاں گئی تھیں؟ اس نے مجھے بڑی سادگی سے جواب دیا: وہ لوگ بھی بھوکے تھے۔ جس چیز نے مجھے چونکا دیا وہ یہ کہ اسے معلوم تھا کہ اس کے علاوہ کون لوگ

بھوکے ہیں ___ ایک مسلمان خاندان۔ میں اس شام چاول زیادہ مقدار میں نہیں لائی تھی لیکن میں نے اس حسن کو محسوس کر لیا جو مل جل کر کھانے میں ہوتا ہے۔ وہ بچے بہت خوش تھے، ان کی ماں محبت بانٹ رہی تھی اور وہ اس محبت میں شریک تھے، ان کی ماں کے پاس انہیں دینے کے لئے کھانا تو نہیں تھا لیکن محبت تھی۔ آپ نے دیکھا محبت کہاں سے شروع ہوتی ہے، اپنے گھر سے۔ میں آپ سے بھی یہی توقع رکھتی ہوں۔ میں اس محبت کے لئے بہت مشکور ہوں جو مجھے آپ لوگوں سے ملی۔ یہ میرے لئے ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ انہی بچوں کی طرح دیگر غریب و مفلس بچوں کو محبت، دیکھ بھال اور پیار کی ضرورت ہے۔

آئیں ہم خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آئے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ اسی ہم آہنگی سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم نہ صرف ہندوستان اور افریقہ بلکہ پوری دنیا کے بچوں کی مدد کر سکیں کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے مشن سے تعلق رکھنے والی سسٹرز کا دائرہ کار پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس انعامی رقم سے، جو مجھے آج ملی ہے، میں ایک ایسا مرکز بنانے کی کوشش کروں گی جہاں بے گھر افراد رہ سکیں۔ چونکہ میرا ایمان ہے کہ محبت کا آغاز گھر سے ہوتا ہے، اگر ہم غریب کے لئے گھر بنائیں تو زیادہ سے زیادہ محبت پھیلے گی اور ہم اس قابل ہوں کہ امن قائم کر سکیں اور غریب کو خوشخبری سنا سکیں۔ پہلے اس غریب کو جو ہمارے گھر میں ہے ہمارے ملک میں اور پھر پوری دنیا میں۔ ایسا سب کچھ کرنے کے لئے ہماری سسٹرز کو مسلسل یسوع سے رابطہ جوڑنا چاہیے تاکہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور لوگوں کے درد میں شریک ہو سکیں۔

آج کے اس دور میں مصائب و آلام کی بہتات ہے، میں یہ سمجھتی ہوں کہ یسوع کے جذبے کا احیاء ہونا چاہیے، ہمیں اس جذبے کے احیاء کے لئے تیار رہنا چاہیے ___ کیا ہم تیار ہیں؟ کیا ہم لوگوں کے دُکھ درد میں شریک ہیں؟ مغربی دنیا میں غربت پر کنٹرول کرنا سب سے مشکل ہے۔ مشرق میں جب میں کسی بھوکے شخص کو سڑک سے اٹھاتی ہوں، ایک پلیٹ چاول دیتی ہوں، روٹی دیتی ہوں تو میں مطمئن ہو جاتی ہوں کہ میں نے اس کی بھوک مٹا دی، لیکن ایک ایسا شخص جسے گھر سے نکال دیا گیا، جو خود کو غیر ضروری سمجھ رہا ہو، محبت سے محروم ہو، خوفزدہ ہو، اسے معاشرے سے باہر بھی نکال دیا گیا ہو۔ یہ غربت بڑی تکلیف دہ ہے اور اس کا تدارک اس سے بھی مشکل، ہماری ساتھی سسٹرز مغربی دنیا میں موجود ایسے لوگوں پر کام کر رہی ہیں۔ لہٰذا آپ لوگ ہمارے لئے دعا کریں کہ ہم یہ سب کچھ کامیابی کے ساتھ کر سکیں۔ ہم یہ کام آپ لوگوں کے تعاون کے بغیر نہیں کر سکتے۔

آپ لوگوں کو اپنے ہی ملک میں کام کرنا ہوگا، آپ کو غریب لوگوں سے متعلق جاننا ہوگا ہو سکتا ہے ہمارے لوگوں کے پاس مادی اشیاء ہوں، ہر چیز میسر ہو لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ہم سب لوگ اپنے گھروں کی طرف دیکھیں تو ہم ایک دوسرے کے سامنے مسکرانا کتنا مشکل محسوس کرتے ہیں، یہی مسکراہٹ محبت کا آغاز ہے۔ آئیں ہم سب ہمیشہ ایک دوسرے کو مسکراہٹ کے ساتھ ملیں، مسکراہٹ سے

محبت کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب ہم نے ایک دوسرے سے محبت کا آغاز کر دیا تو ہم ہر کام با آسانی کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ پوری دنیا میں موجود ہمارے مشن پر کام کرنے والی سسٹرز، برادرز اور ان کے کارکنوں کے حق میں دعا کریں کہ ہم لوگ خدا کی اس نعمت سے وفادار رہیں، اس محبت پر گامزن رہیں اور اس کی مخلوق کے غرباء کی خدمت کرتے رہیں۔ ہم نے اب تک جو کچھ کیا وہ کبھی نہ کر پاتے اگر آپ لوگ اپنی دعاؤں، اپنے تحائف اور مسلسل امداد سے ہمیں نہ نوازتے لیکن میں یہ کہوں گی کہ آپ صرف اپنی زائد آمدنی میں سے ہمیں مت دیں، آپ ہمیں ایسے نوازیں کہ نوازش و سخاوت (یسوع کی طرح) آپ کو تکلیف کی منزل تک لے جائے۔ ایک دن مجھے ایک ایسے شخص سے 15 ڈالر موصول ہوئے جو بیس سال سے مفلوج ہے، وہ صرف اپنا دایاں ہاتھ ہلا سکتا ہے اور اس کا صرف ایک ہی ''ساتھی'' ہے وہ ہے سگریٹ۔ اس نے کہا: میں نے ایک ہفتے تک سگریٹ نہیں پی اور یہ رقم آپ کو بھیج دی۔ یہ اس شخص کی بہت بڑی قربانی ہے، لیکن دیکھئے اس نے کس طرح اس کام میں حصہ لیا۔ میں نے اس رقم سے روٹی کا اہتمام کیا اور بھوکے افراد میں تقسیم کر دی، اس طرح دونوں طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی، ایک دے رہا تھا اور دوسرا لے رہا تھا۔ ایک دوسرے سے محبت کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ اس کام کو ایسے سرانجام دیں جیسے ہم یہ سب کچھ یسوع کے لئے کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے ایسے محبت کریں جیسے وہ ہم سے کرتا ہے۔

میں اس لمحے کو کبھی نہیں بھول سکتی جب امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے چودہ پروفیسر صاحبان کلکتہ ہمارے مرکز میں تشریف لائے، گفتگو کرتے کرتے وہ ہمارے ادارے کے اس حصے میں چلے گئے جو ان افراد کے لئے مختص ہے جو قریب المرگ ہوں۔ کلکتہ میں یہ ہمارا ایسا مرکز ہے جہاں ہم نے اسی شہر کی گلیوں سے تقریباً 36000 افراد کو اُٹھایا، ان میں سے 18000 فوت ہو گئے، ان کی موت کو ''شاندار موت'' کہنا بے جا نہ ہوگا۔ پروفیسر صاحبان نے اس مرکز کا معائنہ کرنے کے بعد مجھ سے کہا: مدر! ہمیں کوئی ایسی چیز بتائیں جو ہم یاد رکھیں اور میں نے کہا: ایک دوسرے سے مسکراہٹوں کا تبادلہ کریں، اپنے خاندان میں ایک دوسرے کے لئے وقت نکالیں۔ ہمیں زندگی بڑی خوبصورت بنانی چاہیے۔ یسوع ہمارے ساتھ ہے اور وہ ہم سے محبت کرتا ہے، خدا ہم سے محبت کرتا ہے۔ اگر ہم صرف یہ ذہن نشین کر لیں کہ خدا مجھ سے محبت کرتا ہے اور مجھے دوسروں سے محبت کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ محبت بڑی چیزوں میں نہیں، چھوٹی چیزوں میں بڑی محبت، تو ناروے امن کا آشیانہ بن جائے گا اور یہ بات کتنی شاندار ہوگی کہ یہاں ایک امن کا گہوارہ تشکیل پائے۔ اگر آپ لوگ امن کی دنیا میں مشعل بردار کی حیثیت اختیار کر لیں تو واقعی امن کا نوبل انعام ناروے کے لوگوں کا ایک تحفہ ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر انوار احمد

ایک عمر کئی زندگیاں

کردار:

۱۔ نیلم: ایک نوجوان تعلیم یافتہ لیڈی رپورٹر
۲۔ سلیم: ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال، لاابالی نوجوان
۳۔ منور: ایک ادھیڑ عمر سرمایہ کار
۴۔ بیگم منور: ڈھلتی عمر کی ایک مجلسی خاتون جسے بالائی طبقے میں سے ہونے کا احساس ہے
۵۔ ایڈیٹر: علم کے زعم میں مبتلا
۶۔ صابرہ: ایک اَن پڑھ گھریلو لڑکی جس کے لب ولہجہ سے پنجابی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔
۷۔ رفیق: صابرہ کا شوہر جس کے لہجے سے اس کا روہتکی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔
۸۔ پروفیسر واسطی
۹۔ امتیاز خواجہ
۱۰۔ مسز خواجہ

نیلم: ''ذرا سی مسکراہٹ، مسز منور''
(کیمرے کے کِلک کرنے کی آواز) جی، تھوڑی سی اور پلیز۔''
منور: ''چلیں جی، اسی بہانے ہم نے آج انہیں مسکراتے بھی دیکھ لیا ہے۔''
نیلم: ''یہ تو یقیناً آپ مذاق کر رہے ہیں، ویسے مثالی جوڑے میں اس طرح کی حِس مزاح روشنی بکھیرتی رہتی ہے۔''
بیگم منور: ''بس، ان کی حِس مزاح بھی مہمانوں کو دیکھ کر جاگتی ہے، خاص طور پر خوبصورت مہمانوں کو دیکھ کر۔''
نیلم: ''مجھے احساس ہے کہ آپ دونوں بہت مصروف ہیں اور یہ بھی آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے ہمیں اپنے اخبار کے خصوصی صفحے کے لیے انٹرویو کی خاطر وقت دیا ہے، مگر یہ پلیز ایک ایک کاغذ ہے، آپ اسے پُر کر دیجیے، اس میں تو وہی عام سی باتیں ہیں، آپ کا پسندیدہ پھول، پسندیدہ خوشبو، پسندیدہ کھیل اور کھلاڑی وغیرہ، یہ ہم علیحدہ باکس میں دیں گے، یہ بھی آپ کر دیجیے گا اور ساتھ ہی ہم باتیں بھی کرتے جاتے ہیں، ہاں منور صاحب، آپ کی بیگم صاحبہ سے شادی محبت

بیک نگاہ کا کرشمہ ہے یا والدین اور بزرگوں کی جانب سے طے کردہ؟''
منور: ''وہ جی ہمیں فخر ہے اپنی مشرقی اقدار و روایت پر، میں نے ایک تقریب میں انہیں چوڑی دار پائجامے اور تِلے (طِلّے) کے کام والی ملتانی جوتی پہنے دیکھا تھا، میں نے تو دل کے کبوتر دونوں ہاتھوں سے اُڑا دیئے، پھر جی کافی جتن کے بعد ہماری شادی ہوئی۔''
نیلم: ''بیگم شاہین، آپ منور صاحب کے جتنوں، کی کچھ تفصیل بتائیں گی؟''
بیگم منور: ''اصل میں میری نسبت میرے ایک کزن خالد حسن سے طے تھی، اب وہ آسٹریلیا میں ہی settled ہیں، ان دنوں آئے ہوئے ہیں، وہاں ان کی بڑی حیثیت ہے، پر منور صاحب کی ایک آپا تو ہمارے گھر میں آ کر بیٹھ گئیں''۔
نیلم: ''اچھا تو یہ جتن کئے منور صاحب نے؟'' (ہنستے ہوئے)
بیگم منور: ''اصل میں مجھے بعد میں پتا چلا کہ منور صاحب حکمتِ عملی کے ماہر ہیں، نفسیاتی حکمتِ عملی کے، ایک فضا بناتے ہیں، اس وقت بھی انہوں نے رابطے کی کوششیں کیں، تعاقب، سیٹیاں اور ٹھنڈی آہیں، ہیئر سٹائل بھی تبدیل کر لیا، اور اتنے بہت سے لوگوں سے کہا کہ انہیں محبت ہو گئی ہے، آہستہ آہستہ اتنے بہت سے لوگوں سے سُن سُن کر مجھے بھی یقین آ گیا کہ یہ مجھے چاہتے ہیں اور آپ پتا نہیں جانتی ہیں یا نہیں کہ چاہے جانے کا احساس، آپ کو بے بس کر دیتا ہے۔''
نیلم: ''منور صاحب، چوڑی دار پائجامے نے آپ کی محبت کے تجربے کو سادہ ہی رہنے دیا یا پیچیدہ بنا دیا؟''
منور: (ہنستے ہوئے) ''آپ کے اس سوال نے بہت مزہ دیا ہے، غور کروں گا کہ یہ تجربہ میرے لیے سادہ تھا یا؟ میرا خیال ہے کہ اتنا سادہ نہیں تھا۔''
بیگم منور: ''دیکھیں جی، بات اتنی سادہ نہیں تھی، میرے ددھیال اور ننھیال بہت صاحبِ حیثیت تھے، میرے ابا جی، جس پوسٹ پر تھے، اس سے منور صاحب کو اپنے انڈسٹریل یونٹ لگانے میں مدد ملی۔''
منور: ''شاہین، ڈونٹ ٹاک نان سینس (کھسیانا ہو کر ہنستے ہوئے) دیکھیں جی، ان کے اندر بڑی حِس مزاح ہے، پلیز، یہ اخبار میں نہ لکھیے گا، بلکہ اسے ریکارڈنگ سے نکال دیں۔''
نیلم: ''آپ فکر نہ کریں، مَیں اسے ایڈٹ کروں گی، پھر ہمارے ایڈیٹر صاحب اس کی نوک پلک سنواریں گے، ہاں تو منور صاحب، آپ کے بزرگوں یا دوستوں میں کوئی ایسا مثالی جوڑا تھا، جسے دیکھ کر آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ آپ بھی ان کی طرح کی زندگی گزاریں''؟
منور: ''بالکل، بالکل میری اپنی والدہ اور والد ایک مثالی جوڑا تھے اور ماشاء اللہ ہیں، والد صاحب میرے پچیس سال سعودی عرب میں رہ کر باقاعدگی سے ڈرافٹ بھیجتے رہے، میری والدہ ان کی

بہت قدر کرتی تھیں، وہ جب بھی عید، بقرعید پر آتے تھے، میری والدہ ان کی بہت خدمت کرتی تھیں، انہیں باقی عزیزوں، رشتہ داروں سے ملنے بھی نہیں جانے دیتی تھیں، اور وہ بھی میری والدہ کی ہر قسم کی تلخ ترش سن کر مسکراتے رہتے تھے۔''

بیگم منور: ''ان کی وہاں ایک شادی کا چرچا ہوا تھا، مگر جی ماشاءاللہ ہماری ساس کا جلال اور دبدبہ ایسا تھا کہ ان کے ابا جی نے دوگناحقِ مہر ادا کر کے، اس بیچاری سے علیحدگی اختیار کر لی۔''

منور: ''شاہین، ایسا نہیں تھا، یہ بس ہمارے مخالفوں کا پروپیگنڈہ تھا اور وہ تو سرگودھے والی ہماری پھوپھی نے کوشش کی تھی کہ ان کی ایک بیوہ نند سے ابا جی شادی کر لیں، مگر ہماری امی سرگودھا جا پہنچیں اور ہماری پھوپھی اور پھوپھا کی علیحدگی ہوتے ہوتے رہ گئی۔''

نیلم: ''تو منور صاحب آپ کے سامنے مثالی زندگی کا تصوّر بلکہ مثال اپنے والدین کی ہے؟''

منور: ''جی، بالکل، اس کے علاوہ دیکھیں ناں ہمارے مذہب، ثقافت، سماج نے عورت کو بہت عزت دی ہے، آزادی ہے، بس ذرا یہ مرد کی اطاعت کرے، اس کی خدمت کرے تو پھر عورت کی بڑی عزت ہے جی۔''

بیگم منور: ''اطاعت؟ خدمت؟ اصل میں شوہر کے ذہن میں مثالی بیوی کی اطاعت گزاری اور خدمت کا جو تصور ہے، وہ چند سو روپے یا دو تین ہزار روپے میں گھر کی آیا کر سکتی ہے، مرد کے گھر واپس آنے پر بھاگ کر دروازہ کھولے، جوتے اُتارے، جرابیں دھونے کے لیے رکھے، آرام کرنے کے لیے گھریلو کپڑے دے اور جلدی سے گرم گرم روٹی پکانا شروع کر دے۔''

نیلم: ''وہ جی، یونیورسٹی کے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ نے ایک سٹڈی کرائی ہے کہ جن علاقوں میں دوپہر یا سہ پہر کے وقت پکی پکائی گرم روٹی مل جاتی ہے، وہاں طلاق کی شرح کم ہے، اصل میں گرم روٹی اور خوشگوار ازدواجی تعلقات کا کوئی تعلق ہے جی۔''

بیگم منور: ''اصل میں بڑے stakes ہوتے ہیں، سوشل پریشرز ہوتے ہیں، کمپرومائزز ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ فلاں فلاں اتنے برسوں سے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں، ورنہ اب زندگی کے اتنے رنگ دریافت ہو چکے ہیں کہ کوئی آسانی سے یک رنگی کی زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

منور: ''حقیقت یہ ہے کہ وقت بدل گیا ہے، ہم سب بدل گئے ہیں، وہ صبر، شکر، ایثار، قناعت اور سادگی زندگی سے نکل گئی ہے، اس کی جگہ خودغرضی اور منافقت نے لے لی ہے، ہم دونوں کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے فیکٹری مزدوروں کو اپنے نوکروں کو خلوص اور سادگی کی زندگی گزارنے کی تلقین کریں، بس جی انسان تو تلقین ہی کر سکتا ہے، آگے تو عمل کرنے والے پر ہے۔''

نیلم: ''تو آپ کا کہنا ہے کہ وقت اور اقدار کی تبدیلی کے باوجود آپ دونوں کے مابین ذہنی ہم آہنگی

بڑھتی جا رہی ہے، ایک دوسرے کے احترام اور رواداری کے باعث آپ کو تمام احباب کی نظر میں مثالی جوڑے کا درجہ حاصل ہے۔''

بیگم منور: (تلخ ہنسی ہنستے ہوئے) ''ہمیں تو جی، ایوارڈ مل چکے ہیں، انجمن انسدادِ بے رحمیٔ زناں شوہراں، تو ہمارے ساتھ ایک شام بھی منا چکی ہے، بہت ساری مصالحتی کمیٹیوں کے ہم رکن ہیں، بہت سارے جوڑے تو ہماری جلن کی وجہ سے طلاق لیتے لیتے رہ جاتے ہیں۔''

نیلم: ''چلیں جی، حسد کا کوئی مثبت پہلو تو سامنے آیا۔''

(موبائل کی گھنٹی بجتی ہے، دوسری گھنٹی پر منور سنتا ہے)

منور: ''دیکھیں، اس وقت میں ایک سوشل انٹرویو دے رہا ہوں، آپ دس منٹ کے بعد کال کریں، (لہجے کو نرم بنا کر) ضد نہ کریں، کہا جو ہے۔''

بیگم منور: ''تمہیں چاہیے کہ اسے off کر دو۔''

نیلم: ''فون کو یا کالر کو؟''

منور: ''آپ چھوٹی سی عمر میں بڑی witty ہیں، آپ جانتی ہیں کہ wit کا بڑا تعلق ذہانت کے ساتھ ہے، اور ہمدردی کے ساتھ بھی، پتا نہیں اب انٹرویو چھپنے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ آپ کتنی ہمدرد ہیں اور کتنی بے درد۔''

نیلم: ''آپ کے گھر کے لان اور کمروں کی تزئین میں یقیناً بیگم منور کی حسِ جمالیات کا دخل ہوگا؟''

بیگم منور: ''جی شروع تو میں نے کیا تھا، مگر میری بیٹی تزئین کو اس کا کریڈٹ جاتا ہے، وہ مالیوں اور نوکروں سے کام لیتی ہے، اور بہت اچھے طریقے سے۔''

نیلم: ''کتنے بچے ہیں آپ کے؟''

منور: ''ایک بیٹی، تزئین ہے جی، ہماری، ہم دونوں کی محبت اور رفاقت کی نشانی، ہماری امیدوں کا مرکز، اولیول کر رہی ہے، اُسامہ کے خلاف سی این این نے نظموں کا مقابلہ کرایا تھا، اس میں بھی گفٹ جیتا تھا، جی اس نے، ہماری تو اس نے بنیادیں مضبوط کر دی ہیں، اس نے، حالانکہ وہ خود بنیاد پرستی کی مخالف ہے۔''

نیلم: ''پر منور صاحب، آپ تو قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے بہت متحرک ہیں، مگر آپ کی بیٹی؟''

منور: ''دیکھئے، یہ جو وطن ہے ناں، یہ وطنِ عزیز ہے، ہم نے اسے لاکھوں قربانیاں دے کر بنایا ہے، اب اگر اسے ترقی دینی ہے، اس کے لوگوں کو ترقی یافتہ قوموں سے ہم کلام ہونے کا شرف دینا ہے، تو ہمیں ابھی اور قربانیاں دینی ہوں گی۔''

نیلم: ''جس میں قومی زبان کی قربانی بھی شامل ہے؟''

بیگم منور: ''یہ تو ذرا گھما پھرا کے بات کرتے ہیں، مَیں ہوں جی فرینک اور صاف گو، دیکھیں تیسری دنیا میں نوے فیصدی لوگ نظام کے تابع ہوتے ہیں، دس فیصد نظام چلانے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس وسائل ہیں، ہمیں حق ہے کہ اپنے بچوں کو ان دس فیصد میں رکھنے کے لیے تیار کریں۔''

(موبائل کی گھنٹی بجتی ہے)

منور: ''پلیز، مَیں نے دس منٹ کہا تھا، آئی ایم کومیٹڈ آف کورس! خرید لو، سارا سٹاک خرید لو۔''

بیگم منور: ''سٹاک کو ڈورڈ ہے ناں منور اس نیکلس کے لیے، جس کا وعدہ تم نے اپنی نئی سیکرٹری سے کیا ہے۔''

منور: ''ڈونٹ بی سِلّی۔''

بیگم منور: ''تم نے سٹاک کے لیے کومٹ منٹ کی بات کیوں کی؟''

منور: ''بس جی، آپ عورتیں جتنی بھی پڑھ لکھ جائیں، رہتی وہی ہیں، شکّی، بال کی کھال اتارنے والی، چوکیدار، غیر محفوظ۔''

بیگم منور: ''میں ان روایتی بیویوں سے مختلف ہوں، جنہیں شوہر مختلف بہانوں سے بیوقوف بناتے اور دھوکہ دیتے ہیں۔''

منور: ''میں دھوکہ باز نہیں ہوں، تم ہو، تم کل شام خالد حسن کے ساتھ کمپنی باغ میں کیا کر رہی تھیں؟''

بیگم منور: ''جاگنگ، آف کورس جاگنگ، مگر مَیں تمہاری طرح سیکرٹری کو بائی پاس پر ڈرائیونگ نہیں سکھا رہی تھی۔''

منور: ''خالد نے تمہیں جو لاسٹ خط لکھا ہے، مَیں وہ پڑھ چکا ہوں۔''

بیگم منور: ''تم میرے ذاتی خط بھی پڑھ سکتے ہو، مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے نیچ ہو۔''

منور: ''مَیں نے یہی نہیں، تمہارے بھی ایک دو ایسے خط دیکھے ہیں، جو تم نے اسے لکھے ہیں؟''

بیگم منور: ''اصل میں تمہارا قصور نہیں، تم نیچے سے اوپر آئے ہو، تمہاری اماں بھی یہی جاسوسیاں کیا کرتی تھی؟ اب تم بھی یہی کرتے ہو۔''

(دونوں کا شور بڑھتا ہے، نیلم دونوں سے کہتی ہے، پلیز، پلیز، مگر چیزیں ٹوٹنے کی آوازیں آتی ہیں اور نیلم کی آواز وقتی طور پر دب جاتی ہے)

نیلم: ''اچھا جی بہت بہت شکریہ منور اور بیگم منور!''

(اخبار کے دفتر کا منظر، ٹیلی فون اور ٹیلی پرنٹر، پس منظر میں آوازیں)

نیلم: (فون پر مخاطب ہے) ''سر میں نیلم بول رہی ہوں، میں سر آپ کی سٹوڈنٹ تھی تین سال پہلے، جی میں نیلم ہوں، جی جی میں نے ہی پچھلے دو مہینوں میں آپ کے ہاں بار بار پیغام چھوڑا، جی سر میں اب قومی اخبار میں ہوں، وہ سر میں آپ کا اور آپ کی بیگم صاحبہ کا انٹرویو کرنا چاہ رہی ہوں،

وہ سر گھر پر نہیں ہیں، کب تک آ جائیں گی؟ سر آپ کو اندازہ نہیں آپ تو ہمیں رفتارِ عالم کے اندازے کلاس میں بتایا کرتے تھے۔ وہ سر مجھے اندازہ ہے، آپ نے ایک مرتبہ کلاس میں ہم لڑکیوں کو منع بھی کیا تھا کہ آپ کے گھر میں فون نہ کیا کریں، جی سر، آئی ایم سوری سر! پھر سر آپ کی دعاؤں اور مشوروں کے لئے حاضر ہوں گی کبھی'' (فون بند کر کے ایک اور نمبر ملاتی ہے) ''اللہ میاں پلیز! جی دیکھئے ڈاکٹر ظہور صاحب یا مسز ظہور ہیں؟ جی نہیں ہیں، آرام کر رہی ہیں، میرا نام نیلم ہے، میں دو گھنٹے بعد فون کروں گی، چیلم نہیں نیلم، نیلم ہے میرا نام'' (پھر فون ملاتی ہے) ''اوہ کٹ گیا'' اس دوران بزر ہوتا ہے، انٹر کام پر ایڈیٹر کی آواز آتی ہے

ایڈیٹر: ''نیلم ذرا آ جایئے''

نیلم: ''جی سر آ رہی ہوں'' (بڑبڑاتی ہوئی) ''لگتا ہے کسی نے پھر شکایت کر دی ہے، ایک تو ہمارے ایڈیٹر کانوں کے بہت کچے ہیں، اللہ میاں، اس دفعہ بچا لے''

(دروازہ ناک کر دی ہے)

ایڈیٹر: جی آیئے، آیئے، تشریف لایئے۔ آپ نے ماس کمیونی کیشن میں ماسٹرز سے پہلے غالباً ایم اے اردو بھی کیا تھا''؟

نیلم: ''جی سر، وہ جی''

ایڈیٹر: ''آپ نے دیکھا؟ قدسیہ بیگم کے سفر نامے کی چھپی ہوئی قسط دیکھی ہے، میگزین سکشن میں؟ (ٹیلی فون پر گھنٹی بجتی ہے) دیکھو، میں ایک ضروری بات کر رہا ہوں، کوئی بہت بڑی تبدیلی کی خبر آ جائے تو بات کرانا، ورنہ ابھی نہیں، ہاں تو محترمہ نیلم صاحبہ! قدسیہ بیگم کے بارے میں آپ جانتی ہیں ناں''؟

نیلم: ''جی سر وہ ہمارے اخبار کے مالک کی نواسی ہیں، انہوں نے ترکی سے واپس آ کر چند باتیں اپنی سیکرٹری کو بتائی ہیں، وہ ان کے لئے سفر نامہ لکھ رہی ہیں۔''

ایڈیٹر: میں نے آپ سے بیک گراؤنڈ سٹوری نہیں پوچھی، صرف یہ پوچھا ہے کہ آپ کو ہی اِسے ایڈٹ کرنے اور کمپوز کرانے کے لیے میں نے دیا تھا؟''

نیلم: ''جی سر، مَیں نے اس پر بہت محنت کی تھی، سر، اس میں املاء کی بہت سے غلطیاں تھیں، مَیں نے اس پر بہت محنت کی تھی، سر۔''

ایڈیٹر: آپ کو املاء کا ادراک ہے؟''

نیلم: ''جی سر؟''

ایڈیٹر: ''آپ کو پتا ہے کہ ہمارے اخبار کی بہت روشن روایات ہیں، لوگ اسے قومی زبان کی سند کا درجہ دیتے ہیں۔''

نیلم: ''جی سر!''

ایڈیٹر: ''آپ نے پڑھا؟ دیکھئے آپ دیکھئے، یہ سولہ سرخ نشان ہیں، دیکھیں آٹھ مرتبہ مولانا جلال الدین رومی کے روضے کا لفظ آیا ہے، ہر مرتبہ یہ 'ض' کی جگہ 'ز' سے لکھا ہوا ہے، چار مرتبہ وہاں مامور دربان کا ذکر آیا اور مامور'ا' کی بجائے 'ع' سے لکھا گیا، جانتی ہیں ناں کہ معمور (ع حلق سے نکال کر) اور مامور میں کیا فرق ہے، روضہ اور روزہ میں کیا امتیاز ہے، میری نظر میں آپ ہی نہیں آپ کے اساتذہ بھی مشکوک ہو گئے ہیں۔''

نیلم: ''سر، حقیقت میں جو علم اور تجربہ آپ کے پاس ہے، وہ ہماری یونیورسٹی کے استادوں کے پاس بھی نہیں، پھر سر آپ تو خود ایک عظیم ادیب اور دانشور ہیں۔''

ایڈیٹر: ''عظیم 'ظ' سے ہی ادا کر رہی ہیں یا آپ کے ذہن میں اس کی کوئی نرالی املا ہے؟''

نیلم: ''نہیں سر آپ عظیم ہی نہیں، عظیم المرتبت بھی ہیں، آئندہ سر ایسی غلطی نہیں ہوگی، حقیقت میں سر عظیم لوگ اپنی جگہ درسگاہیں ہوتے ہیں۔''

ایڈیٹر: ''وہ مثالی میاں بیوی والا انٹرویو فائنل ہو گیا؟''

نیلم: ''وہ سر، انٹرویو کے دوران منور صاحب اور مسز منور کا جھگڑا ہو گیا، جب انہوں نے ایک دوسرے پر چیزیں اُٹھا کے پھینکیں تو سر میرا ٹیپ ریکارڈر بھی ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ کیمرہ میں نے بڑی مشکل سے بچایا۔''

ایڈیٹر: ''اس لڑائی کے موقع پر آپ نے کچھ شاٹس لئے؟''

نیلم: ''ایک سنیپ بڑی مشکل سے، ٹیپ میں بھی بڑی بُری آوازیں ریکارڈ ہو گئی ہیں۔''

ایڈیٹر: ''اسے سنبھال کر رکھیں، مَیں بورڈ آف منیجمنٹ میں اس حوالے سے ایک تجویز پیش کروں گا، میرا خیال ہے کہ یہ آئیڈیا چلے گا، بالکل چلے گا، ویسے آپ جلدی سے ایک آدھ جوڑے کا دو دن میں انٹرویو تیار کریں اور ہاں یہ افریقہ کے اس شخص کی سٹوری لے جائیں، جس کی چالیس بیویاں اور ایک سو ساٹھ بچے ہیں، اس کا ترجمہ کر کے میگزین سیکشن کو دے دیں، اچھا تو مامور ہوا، کسی کام پر لگا ہوا، اَمر سے اور یہ معمور (ع نکال کر حلق سے) ہوا بھرا ہوا، لبریز۔''

نیلم: ''بہت شکریہ، سر (راستے میں بڑبڑاتی ہوئی) اب کیا کیا جائے، سڑک پر جاتے ہوئے کسی مثالی جوڑے کا تو انٹرویو نہیں لیا جا سکتا، ارے، تم کب آئے سلیم؟''

سلیم: ''دس منٹ ہو گئے، معلوم ہوا کہ ایڈیٹر صاحب کے پاس پیشی تھی۔''

نیلم: ''یار سلیم، ایک مثالی جوڑے کا انٹرویو لینا ہے، اور فیچر لکھنا ہے، کل تک، پلیز مدد کرو۔''

سلیم: ''وہ تو دنیا میں اب ایک ہی رہ گیا ہے، تمہارا اور میرا۔''

نیلم: ''شٹ اپ، میں سیریس ہوں، یہ انکریمنٹ نہیں دیں گے اور ممکن ہے کہ پروبیشن بھی Extend

کر دیں۔''

سلیم: ''موٹر سائیکل حاضر ہے، سڑکوں پر، ہسپتالوں میں، بس اڈوں پر، ریل گاڑی میں، قبرستانوں میں، مزاروں پر کہیں نہ کہیں ہمیں مثالی جوڑا مل ہی جائے گا۔''

نیلم: ''گھروں پر کیوں نہیں؟ آخر شہروں سے، گھروں سے، محبت، ایثار، ذہنی ہم آہنگی کیوں غائب ہو گئی ہے؟''

سلیم: ''ننھی چڑیا چوں چوں بہت کرتی ہے، پر نہیں جانتی کہ یہ چیزیں دلوں سے غائب ہوتی ہیں، پھر گھروں سے کوچ کرتی ہیں، گھروں کے مقفل دروازوں اور رائفل بردار پہریداروں کو بھی پتا نہیں لگتا کہ دلوں کے گھر کیسے خالی ہو جاتے ہیں!''

نیلم: ''سلیم پلیز، پوئٹری نہیں، انشا پردازی نہیں، تقریریں نہیں، پلیز سیدھی سادی بات کہ یہ لیڈیز کلب، یہ مقدس تہوار، یہ فنکشن اس میں آنے والی مہذب شخصیتیں یہ شائستہ، کھنکتے ہوئے لوگ، یہ اندر سے خالی کیوں ہو گئے؟''

سلیم: ''شائستہ؟ کنستر کی طرح کھنکتے ہوئے لوگ! میری بات یاد رکھو آخر اس دنیا میں لوگ مثال کے لیے تمہیں اور مجھے ہی دیکھیں گے، یاد رکھنا، آؤ۔''

(مختلف جگہوں پر جانے اور گھومنے کا تاثر)

سلیم: ''ہاں بھئی یہی گھر ہے، رفیق بنیانوں والے کا، جہاں آس پاس کے رہنے والوں کا کہنا ہے کہ تمہارا مطلوبہ جوڑا رہتا ہے، وش یو گڈ لک، اور ہاں اپنی اماں کو کب تمہارے گھر بھیجوں۔''

نیلم: ''تم ابھی جاؤ، منہ بھی دھوؤ اچھی طرح اور یاد رکھو مَیں نے کسی موٹر سائیکل والے سے شادی نہیں کرنی۔''

(ذرا سے وقفے کا تاثر)

صابرہ: ''بس جی، مجھے تو بہت سی باتیں کرنی نہیں آتیں، نہ بہت زیادہ بولنا آتا ہے، میری بڑی بہن ہوتی تھی، بہت بولتی تھی، مجھے تو ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ جتنی دیر میں کوئی بولے، مَیں آٹا گوندھ لوں، پانی بھر لوں، ڈنگروں کو چارہ ڈال دوں، چارپائیوں کی ادوائن کس دوں، کپڑے دھو دوں، کھانا پکا لوں، صفائی کر لوں، مَیں تو ہمیشہ حیران ہوتی تھی کہ لوگ باتیں اتنی کیوں کرتے ہیں، اتنے تو کام ہوتے ہیں، گھروں میں کرنے کے۔''

نیلم: ''یہ جو چھوٹا سا گھر ہے، اس میں کون سے ڈنگر ہیں، جنہیں آپ چارہ ڈالتی ہیں؟''

صابرہ: ''وہ تو جی عادت تو ہوتی ہے، پہلے ہم گاؤں میں رہتے تھے، میرے اَبا کے گزرنے کے بعد میری اماں پر برادری کے حکم کے مطابق چاچے فضل نے چادر ڈالی تھی، پھر ہم بستی نواب پور آ گئے تھے۔''

نیلم: ''ٹھہرو، ٹھہرو، چادر ڈالی تھی، کیا مطلب؟''

صابرہ: ''وہ جی سر کا سائیں اُٹھ جائے جس عورت کا، تو برادری ہی فیصلہ کرتی ہے ناں کہ اب اس سر پر چادر کون ڈالے گا؟ برادری سے باہر تو عورت نہیں جائے گی ناں؟''

نیلم: ''اور اگر اس وقت برادری میں کوئی مرد غیر شادی شدہ نہ ہو تو؟''

صابرہ: ''وہ جی چاچے فضل کے دو ٹبّر پہلے تھے، پھر اس نے برادری کے حکم پر میری اماں پر بھی چادر ڈال دی، پر جی اللہ برکت دینے والا ہے اور صبر بھی۔''

نیلم: ''پھر تم لوگ نواب پور بستی آ گئے؟ وہی جہاں عورتوں کا جلوس نکالا گیا تھا؟''

صابرہ: ''ہاں جی، میری ماں بھی اس جلوس میں تھی، وہ تو رب کا کرم ہے، اس کی دید جاتی رہی تھی، اس لیے یہ پتا نہیں چلا کہ کون کون بے دید ہو گیا ہے؟''

نیلم: ''اس وقت تمہیں غصّہ آیا تھا، رونا آیا تھا یا ڈر لگا تھا؟''

صابرہ: ''ڈر زیادہ لگا تھا، میں جی رضائیوں والی پیٹی میں چھپ گئی تھی، آواز نکال کر رو بھی نہیں سکتی تھی، پر جی یہ دنیا تو زور والوں کی ہے، اخباراں میں ہماری فوٹواں بھی آئی تھیں، پولیس بھی پچھ پڑتیت کرتی رہی، پھر ہم ادھر سے اُٹھ آئے۔''

نیلم: ''رفیق؟ رفیق نام ہے نا تمہارے گھر والے کا؟''

صابرہ: ''جی، ہاں جی''

نیلم: ''وہ بنیانیں بیچتے ہیں جو انہیں رفیق بنیانوں والا کہتے ہیں؟''

صابرہ: ''اصل میں جی یہ ان کی چھیڑ کا نام ہے، وہ کبھی بنیان نہیں پہنتے تھے، اس لیے محلے والوں نے نام ہی بنیانوں والا رکھ دیا۔''

نیلم: ''ہم نے اِدھر اُدھر سے پوچھا، سب نے کہا کہ اس ٹاٹ والے گھر میں چلے جاؤ، صابرہ اور رفیق رہتے ہیں، دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں، لڑتے جھگڑتے نہیں ہے، مار پیٹ نہیں کرتے ہیں، ورنہ مغرب کے بعد ہر گھر سے ایک جیسی آوازیں آتی ہیں۔''

صابرہ: ''بس جی، دادی میری نے اچھا ہی کیا جو میرا نام صابرہ رکھ دیا۔''

نیلم: ''پر مجھے تو خیال آ رہا تھا کہ جو چیز تم لوگوں کے پاس نہ ہو، وہ چھیڑنے کے لیے نام میں ڈال دیتے ہیں۔''

صابرہ: ''پر جی، میرا خیال ہے کہ مجھ میں بڑا صبر ہے، مجھے جس بی بی نے قرآن مجید پڑھایا ہے، ان میں بھی بڑا صبر تھا، میاں جی، بڑے ظالم تھے، سالن میں نمک زیادہ ہوتا تھا تو بی بی کے شاگردوں کے سامنے ان کو مارتے تھے چونڈے سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیتے تھے، ہم سب کبھی تو اونچی آواز میں روتے تھے اور کبھی ڈر کے مارے چُپ رہتے تھے، مَیں تو جی جب قرآن پڑھتی ہوں، ساتھ روتی بھی رہتی ہوں اپنی بی بی کے لیے۔''

نیلم: ''رفیق سے تمہاری شادی کیسے ہوئی؟''

صابرہ: ''پہلے تو جی مَیں وٹے میں چاچے فضل کے مامے کے گھر گئی تھی، پھر وہ قتل ہو گیا، مجھے سب نے کہا کہ مَیں منحوس ہوں۔''

نیلم: (سنجیدہ اور اُداس ہو کر) ''تم بیوہ تھیں، جب رفیق سے تمہاری شادی ہوئی؟''

صابرہ: ''وہ تو جی کئی مہینوں تک مجھے یہ فرق ہی پتا نہ چلا کہ بیوی اور بیوہ میں فرق کیا ہوتا ہے؟ مَیں بارہ سال کی تھی اور میرا پہلا گھر والا ستر سال کا تھا۔''

نیلم: ''پھر بھی تم نے شادی کر لی؟''

صابرہ: ''شادی کوئی عورت کرتی ہے جی؟''

نیلم: ''رفیق سے تمہاری ملاقات شادی سے پہلے ہوئی تھی؟''

صابرہ: ''ملاقات؟ (ہنستی ہے) ملاقات تو جی آپ بڑے لوگوں کی ہوتی ہے، ملاقات تو میری رفیق سے شادی کے بعد بھی نہیں ہوئی، پر وہ میرا بڑا خیال کرتا ہے، سُکھ دیا ہے جی اس نے مجھے، پچھلی باتیں نہیں کرتا، اگلی باتیں بھی نہیں کرتا، بلکہ دن بھر کی باتیں کرتا ہے وہ مجھ سے شام کو۔''

نیلم: ''وہ تمہیں مارتا بھی ہے؟''

صابرہ: ''دیکھو جی میری گلطی ہوتی ہے اور مجھ سے ہوتی رہتی ہیں گلطیاں۔ پھر اس کا حق ہے جی، وہ میرے کپڑے لتے، روٹی پانی، دوا دارو کا جُمّے دار بھی تو ہے ناں۔''

نیلم: ''کبھی غصے میں آ کے کہتا ہے کہ طلاق، طلاق، طلاق۔''

صابرہ: ''نہیں جی، بس کہتا ہے کاگج لکھ دوں گا، میں ہنس پڑتی ہوں کہ کاگج لکھ ہی نہیں سکتا، پھر وہ بھی شرم سار ہو جاتا ہے۔''

نیلم: ''یہ آس پاس والے، تمہارے ہمسائے تم دونوں کو مثالی میاں بیوی میرا مطلب ہے بہت سے لوگوں سے اچھے میاں بیوی کیوں کہتے ہیں؟''

صابرہ: ''مَیں نے بتایا ناں بی بی کہ باقی سب گھروں سے مغرب کے بعد گھر والیوں کی آواجیں آتی ہیں، نیانوں کے رونے کی بھی اور گھر والوں کے گالیاں دینے کی بھی، پر میرے گھر میں جو بھی ہو جائے، مَیں آواج نہیں نکالتی، پھر رات رات بھر ہلدی لگاتا ہے، ٹکوریں کرتا ہے۔''

نیلم: ''بچے ہیں تمہارے؟ کتنے بچے ہیں؟''

صابرہ: ''وہ جی گجر گئے، تینوں کے تینوں، اس کا مال تھے جی اس نے لے لیا، ایک تو چار سال کی تھی، باقی دودودھ پیتے پیتے چلے گئے۔ بڑے 'پھُل تویذ'' کیئے جی، میری اماں نے، پر وہ تو جی حکم نہیں ہو گا ہمارے لیے۔''

نیلم: ''کیا بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو، تم اپنا علاج کراؤ اور اپنے بچوں کا بھی تم علاج کرا سکتی تھیں۔ اماں تمہاری زندہ ہیں؟''

صابرہ: ''مَیں نے بتایا ناں جی کہ وہ بھی گجر گئیں، پر رفیق نے ان کی بڑی کھدمت کی، ان کی آنکھیں بنوائیں، مرنے سے پہلے بہت کھُش تھیں کہ اب میں منکر نکر کو دیکھ سکوں گی۔''

نیلم: ''ٹھہرو، مَیں تمہاری کچھ تصویریں بنالوں، اِدھر دیکھو، اب ایسے، (کیمرے کی کِلِک کِلِک)

رفیق: ''رے، رے، تیں کیا کری جارئی اے، ہُوٹواں ہینچ رئی اے، ہماری لُگائی کی، رے تیں جُرت کیسے کی، ہمارے گھر کو بجار بناون کی؟''

نیلم: ''دیکھئے، مَیں قومی اخبار سے آئی ہوں، مجھے بتایا گیا کہ آپ دونوں ہنسی خوشی رہتے ہیں۔''

رفیق: ''اور تیں سے برداست نہ ہویا جو گریب لوگ ہسی کھُسی کیوں رہویں ہیں؟ تیں صابرہ کی ہُوٹواں ہوٹلاں، بازاراں میں لگوانے کے لیے اِدر آ گئی؟ تَیں نے کھیال کیا جو رفیک کوئی بے گیرت مرداے، آ پڑیں لُگائی کی ہُوٹواں اکھبار میں دیکھ کر کھُس ہوگا؟''

نیلم: ''دیکھئے رفیق صاحب، آپ اور صابرہ دونوں بہت اچھے ہیں، اب اس دنیا میں اچھے لوگ بہت کم ہوگئے ہیں، ہم انہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، اپنے اخبار کے ذریعے ایسے لوگوں کی باتیں دوسروں تک پہنچا کے ان میں جینے کی آس، اُمید پیدا کرتے ہیں۔''

رفیق: ''مَیں اَن پڑھ جرور اُوں، پر مَیں جانوں رے تھارے سارے اَکھباراں کو تم ساری کھبراں برے لوکاں کی دیتے ہو اور کالک مَلتے رہتے ہو اچھے لوکاں کے منہ پر، گھراں میں آگ لگاتے ہو، تم سارے کے سارے، تیں ہوٹو چھاپے گی صابرہ کی، جِس دن، چار گندی نظراں والے اس پر عاسک ہو جاویں گے (رونے لگتا ہے) تو رفیک کی جندگی میں کیا رہ جاوے گا۔''

صابرہ: ''دیکھو، مَیں بھی بیٹھا ای گئی، نہ چائے پوچھی نہ شربت۔''

رفیق: ''رہن دے شربت وگیرہ، یہ جو پیویں، ہم نہ پلاسکیں انہیں، تَیں گھر کے بھیتاں شیتاں تو نہیں دیئے بیٹھی اس اکھبارنی کو؟''

صابرہ: ''نہیں نہیں، یہ تو تمہارے آنے کا انتظار کر رہی تھی، بڑی اچھی بی بی ہے۔''

رفیق: ''کیا کھاک اچھی اے؟ تَیں پچھلے سال مِرچاں بیچن آئی تھی، اب تک معدے میں درد چل ریا اے، ہم سب کا، تَیں اِب جا، بی بی، ہمارے پر تَرس کھا، جا شابش کوئی بھلا کام کر۔''

نیلم: ''چلیں جی، مَیں صابرہ کی کوئی تصویر نہیں چھاپوں گی، اور نہ انٹرویو، میری دعائیں ہیں، آپ اور صابرہ کے لیے، آپ دونوں کی زندگی مثالی تو نہیں ہے، اب آپ کے گھر میں لگتا ہے زندگی تو ہے، آپ دونوں کے آپس کے تعلقات میں بھی زندگی ہے، میں پھر کبھی نہ کبھی آپ دونوں سے ملنے ضرور آؤں گی۔''

رفیق: ''اپن نیئں ملاں گے تجھ سے، ہاں کہہ دیا اے۔''

پروفیسر واسطی: سارا مسئلہ توازن کھو بیٹھنے کا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جِس مرکز یا نظام سے کوئی معاشرہ توازن حاصل کر سکتا ہے، اس کی ساکھ اور اعتبار جاتا رہا ہے۔''

نیلم: ''سر، آپ ناراض نہ ہوں، آپ جیسے کتابی لوگوں کے پاس بھاری بھرکم تجزیے، علمی اصطلاحیں اور عجیب وغریب تصورات ہوتے ہیں، ہم صحافی سامنے کی حقیقت کی بات کرتے ہیں۔''

پروفیسر واسطی: ''تمہارے سامنے تو اس وقت سلیم ہے، جسے تم بری طرح نظر انداز کر رہی ہو۔''

سلیم: ''تھینک یو سر، ویسے سر جب سے خواتین نے آنکھوں میں مختلف شیڈز کے لینز لگوانے شروع کئے ہیں، کنویں جھانکنا آسان ہوگیا ہے، آنکھوں میں جھانک کر کچھ معلوم کرنا مشکل ہوگیا ہے۔''

پروفیسر واسطی: ''تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو یار؟''

سلیم: ''سر وہی، ایک سوال کہ سنگم ہوگا یا نہیں؟''

نیلم: ''نہیں، کبھی نہیں''

سلیم: ''ایسے نہیں کہو نیلم!''

پروفیسر واسطی: ''اس وقت انسانی سماج کو نئے معاہدہ عمرانی کی اَشد ضرورت ہے۔''

نیلم: (تلخی سے) ''سر، کیا پرانے معاہدۂ عمرانی پر بھی عمل درآمد ہوا ہے؟ اس کی روح کو کسی نے سمجھا بھی ہے؟ طاقت ہمیشہ بدمست اور بے لگام ہوتی ہے، سو چہروں پر تیزاب گرائے جاتے رہیں گے، چولھے پھٹتے رہیں گے، پنچایتیں اجتماعی زیادتی کے فیصلے سناتی رہیں گے، بے لباس عورتوں کے جلوس نکالے جاتے رہیں گے، میرے جیسے صحافی صفحے کالے کرتے رہیں گے، آپ جیسے پروفیسر زندگی کو تبدیل کرنے کی آرزو سے محروم لیکچر دیتے رہیں گے اور سلیم جیسے جولاہے خواب بُنتے رہیں گے۔''

پروفیسر واسطی: ''نیلم کیا ہوا ہے؟ تم ایک دم سے بڑی ہوگئی ہو، سامنے کی کسی سچائی سے بھی بڑی! محض اخبار سے وابستہ ہو کر آدمی فلسفہ نہیں بول سکتا۔''

نیلم: ''سر میری عمر پر نہ جائیں، میری ماں کے ساتھ پوری زندگی جو کچھ ہوا، وہ بھی میری عمر میں شامل ہے، شاہد جیسے گھٹیا آدمی نے جو کچھ میرے ساتھ کیا، وہ بھی میری عمر میں شامل کریں اور اب جو کِسی کمزور کے ساتھ، بے زبان کے ساتھ ہو رہا ہے، وہ بھی سر شامل کریں ناں میری عمر میں۔''

سلیم: (اُداس لہجے میں) ''شاہد کون تھا؟''

نیلم: ''بَس؟ دعوے کرنا، ڈائیلاگ بولنا، کسی اور کو اپنی ذات پر وار دکر کے بولنا اور بات ہے اور سچ مچ جھیلنا، کسی کے ساتھ مل کر جھیلنا اور بات ہے رانجھے بس بیٹھے ونجلیاں بجاتے ہیں، مہینوال بس دریا کنارے بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں، پنہوں ڈاچیوں پر لد کے چلے جاتے ہیں، ساری ملامتیں، دریا کے تلاطم اور صحرا کے بگولے تم لوگوں نے ہمارے لیے لکھ چھوڑے ہیں اور اوپر سے ہمارے

نام صابرہ اور شاکرہ رکھ رکھ خوش ہوتے ہو۔''

سلیم: ''یہ لو، پانی پیو اور کچھ دیر ایسے نہ بولو، پلیز لو۔''

نیلم: (پانی پی کر) ''آئی ایم ساری، واز آئی ساؤنڈنگ اَن کائنڈ؟'' (Was I sounding Unkind)

سلیم: ''کُروال (cruel)، حقیقت میں ظالم، قاتل مگر بہت ہی خوبصورت، تمہارا غصّہ، موت اور مرنے کو بھی پُرکشش بنا دیتا ہے۔''

پروفیسر واسطی: ''بھئی جیسے بعض مقامات پر لکھا ہوتا ہے، یہاں سیاسی گفتگو سے پرہیز کیجیے''، مجھے بھی ایک بورڈ اپنے ڈرائنگ روم میں لکھوا کر لٹکانا ہوگا ''یہاں محبت بھری گفتگو کرنا منع ہے۔''

نیلم: ''سر یقین کریں یہ بظاہر دکھائی نہ دینے والا بورڈ تو ہر جگہ لکھوا کے لٹکا دیا گیا ہے، تمام دفتروں میں، ہسپتالوں میں، سکولوں میں اور تو اور گھروں میں، یہی تو ہم آپ سے پوچھنے آئے تھے، ایسا کیوں ہوا ہے؟''

پروفیسر واسطی: ''مَیں نے تو ایسا نہیں کیا''! (تینوں ہنستے ہیں) اصل میں مَیں یہی بتا رہا تھا کہ توازن کا مرکز کھو گیا ہے، ہم سب اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں، ہر آدمی اس وہم میں مبتلا ہے کہ وہ بہت اچھا ہے، وہ سچا ہے، دیانت دار ہے، با اُصول ہے، منافق نہیں ہے، یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے ایسا کہنے، اصرار کرنے کے باوجود اندھیرا ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔''

سلیم: ''واسطی صاحب، مجید امجد کی نظم یاد آ رہی ہے 'جن لفظوں میں ہمارے دلوں کی بیعتیں ہیں'

پروفیسر واسطی: ''واقعی! میرے بس میں ہو تو آئینے کی صورت اس نظم کو شہر کے سب سے بڑے چوراہے پر لٹکا دوں۔''

سلیم: ''آپ واسطی صاحب، مائنڈ نہ کیجیے گا، آپ کی زبان بھی کچھ بروٹالائزڈ (Brutalised) نہیں ہوگئی؟ دوسری، تیسری دفعہ آپ نے لٹکانے کی بات کی ہے؟

پروفیسر واسطی: ''اصل میں تم نے تازہ، تازہ ایک این، جی، او جوائن کی ہے، اردو بے چاری سے اب تمہارا رشتہ کمزور پڑنا شروع ہوگیا ہے۔ مَیں پہلے آویزاں کرنا کہہ رہا تھا، تمہاری خاطر لٹکانا کہہ دیا۔''

نیلم: ''پُرسَر، یہ اندر سے منشی فاضل ہے، بہت گاڑھی زبان بولتا ہے۔''

نیلم: ''اچھا تو واسطی صاحب، آپ بتا رہے تھے کہ ہماری معاشرتی زندگی توازن سے محروم ہوگئی ہے، مگر سر آپ ایک آدھ طبقے کو سامنے رکھ کر کہہ رہے ہیں۔''

پروفیسر واسطی: ''دیکھو بھئی ہر معاشرے کے لیے طاقت ور لوگ ہی رول ماڈل ہوتے ہیں، تم نے اس دن مجھ سے پوچھا تھا کہ فنون کا تضاد کیا ہے؟ اس کا اُلٹ کیا ہے؟ مَیں نے تمہیں کہا تھا vulgarity، لچرپن، جانتے ہو vulgarity کیا ہے؟''

سلیم: ''فحاشی، سر''

پروفیسر واسطی: ''لچرپن اور لچرپن کہتے ہیں طاقت کے بدمست اظہار کو، یہ بدمست اظہار، کسی قدر یا اُصول کو خاطر میں نہیں لاتا، اسے بڑی بے رحمی سے یقین ہوتا ہے کہ وہ ہر قدر یا اُصول کا خالق ہے، کمزور لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں مگر رشک کرتے ہیں، یہ اس کے تشدد کے ہر حربے سے نفرت کرتے ہیں مگر چوری چوری طاقت ور بننے کی آرزو رکھتے ہیں اور جب بھی انہیں گمان ہوتا ہے کہ انہیں طاقت حاصل ہوگئی ہے، یہ بھی اپنے اپنے دائرہ اثر میں وہی کچھ کرتے ہیں، جس سے یہ نفرت کرتے تھے۔''

نیلم: ''سر آپ بات کو اُلجھا رہے ہیں، بڑی سیدھی سی بات یہ ہے کہ جب تک عورت کو آپ بتاتے رہے کہ اس کی عقل اس کی ایڑی میں ہے، جب تک اسے بتایا کہ جس گھر میں تمہاری ڈولی جا رہی ہے، وہاں سے اب جنازہ ہی آنا چاہیے، جب تک آپ نے اسے ایک انسانی وجود کی بجائے شے کے درجے پر رکھ کر بھی شکر گزار رہنے کے لیے قائل رکھا، جب تک آپ نے کہا کہ اس کا شوہر ہی معاشی کفیل ہے، اور اس کی ازدواجی زندگی بھی شوہر کی خوشنودی تک ہے، تو شاید بہت کچھ یک طرفہ تھا، اب جب کہ شعور آ رہا ہے کہ عورت بھی تعلیم حاصل کر سکتی ہے، اپنے اور بچوں کے لیے نان نفقہ زیادہ عزت کے ساتھ حاصل کر سکتی ہے، اس سے عورت اور مرد کے تعلق میں ایک تبدیلی آ رہی ہے، جسے لوگ مغربیت اور اخلاق سوزی کہے جا رہے ہیں۔''

سلیم: ''واسطی صاحب، میری این جی او کنزیومرز یعنی صارفین کے حقوق کے لیے کام کر رہی ہے، ہم دیواروں سے خاص طرح کے اشتہاروں کے اخباروں میں منتقل ہونے کی سٹڈی کر رہے ہیں، یہ جو بعض خوش خبریوں اور خفیہ وعدوں کا Boom آیا ہے۔''

پروفیسر واسطی: ''ہزاروں برس کا سفر ہے حیوانیت سے انسانیت کا اور اب ان اشتہاروں کے ذریعے انسان کو حیوان بنانے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔''

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، دوسری بیل پر فون سنتا ہے)

پروفیسر واسطی: ''جی آپ خیریت سے ہیں؟ وہ سپیچ آپ کے لیے تیار ہے، جی بھجوا دیئے، اپنے ڈرائیور کو، جی آپ اطمینان رکھیے، بہت آسان لفظ ہیں، نہیں نہیں وہ لفظ بھی ہیں، جن پر تالیاں بجتی ہیں اور اخبار والے سرخیاں بناتے ہیں، ۔۔۔ (فون بند کرتا ہے) بھئی آپ لوگ بیگم منور کو جانتے ہیں؟''

نیلم: ''بہت اچھی طرح، بلکہ جب وہ سکرپٹ سے ہٹ کر بولنے پر مجبور ہوتی ہیں، وہ بھی میرے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ ہے۔''

پروفیسر واسطی: ''بس ایک کالج کی سالانہ تقریب ہے، پہلے پرنسپل صاحبہ کی طرف سے سپاس نامہ لکھنے کی

فرمائش تھی، وہ پوری کی، تو اب مہمانِ خصوصی مسز منور کی تقریر لکھ کر دینی پڑی۔''

سلیم: ''واسطی صاحب ایسے کاموں سے آپ کو کراہت نہیں ہوتی کہ آپ بارسوخ لوگوں کے آلۂ کار کے طور پر اپنے خیالات اور لفظ بیچتے ہیں یا آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ بھی با اختیار ہیں، طاقتوروں کے جلو میں ہیں، سوال بھی خود تیار کرتے ہیں اور جواب بھی، شکوہ بھی اور جوابِ شکوہ بھی۔''

پروفیسر واسطی: ''بس یار کچھ مفاہمتیں ہیں، مجلسی اور گروہی دباؤ ہیں، پہلے مَیں پریشان ہوتا تھا، لیکن اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ کل ۳۱۷ لفظ ہیں، جو ایسی ساری تقریروں میں استعمال ہوتے ہیں، مَیں نے یہ لفظ نکال کر علیحدہ رکھ دیئے ہیں، مجھے سوچنا نہیں پڑتا، دل پر بوجھ نہیں آتا کہ کیسے خیالات اور لفظ ارزاں ہو رہے ہیں۔''

نیلم: ''سر میرا اصل سوال تو باقی ہے کہ مثالی لوگ کہاں گئے ہیں؟ ہمارے گھر اور اجتماعی زندگی ان سے خالی کیوں ہوگئی ہے''؟

پروفیسر واسطی: ''دیکھو جسے مثالی ہونے کا شوق ہوتا ہے، وہ آہستہ آہستہ مصنوعی اور ریاکار ہوتا جاتا ہے، جہاں جہاں میاں بیوی دونوں کو مثالی جوڑا بننے اور کہلوانے کا شوق ہے، ان دونوں کے مابین حقیقی تعلق، اصل زندگی نکل جاتی ہے، آپ کے اخباروں اور تقریبات کو انہی کاغذی پھولوں کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوتی اور اچھائی خود کو مثال کے طور پر منواتی ہے۔''

سلیم: ''سر مَیں اور نیلم اچھے لوگ ہیں؟''

پروفیسر واسطی: ''تم دونوں اچھے نہیں، بہت اچھے لوگ ہو۔''

سلیم ''ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر اور اچھے ہو سکتے ہیں؟''

پروفیسر واسطی: ''بالکل، بالکل''

نیلم: ''اصل سوال یہ ہے سر کہ ہم دونوں اگر اچھے ہیں، ایک دوسرے کو اچھے لگتے ہیں تو کیا ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر اپنی اچھائی برقرار رکھ سکتے ہیں؟ اور موجودہ پسندیدہ خوبیوں کو اور دیر تک پسندیدہ بنا سکتے ہیں؟''

پروفیسر واسطی: ''میرے خیال میں تم دونوں میں یہ صلاحیت ہے، اور پھر یاد رکھو اندھیرے میں ننھا سا دیا، چھوٹا سا جگنو اور بھی چمکتا ہے، خود غرضی اور اپنے آپ سے محبت کے خبط میں مبتلا اس دنیا میں تم دونوں بہت سے لوگوں کا بعض قدروں پر اعتماد بڑھا سکتے ہو۔''

نیلم: ''لیکن سر ہم ایک دوسرے میں علم تو رکھتے ہیں، معلومات نہیں رکھتے۔''

پروفیسر واسطی: ''معلومات کی ضرورت بھی نہیں، احساس اور علم کی ضرورت ہے، وہ تم دونوں کے پاس

وافر ہے، (بیل بجتی ہے) اچھا بھئی میرا خیال ہے کہ مسز منور کا ڈرائیور آ گیا ہے۔''

سلیم: ''ڈرائیور سے جو آپ باتیں کریں گے، وہ بھی انہیں ۳۱۷ الفاظ کا حصّہ ہیں؟''

(پروفیسر واسطی ہنستا ہے)

نیلم: ''سر، اب مجھ میں صحافیانہ تجسس بیدار ہو رہا ہے، یہ آپ کے لیے معاوضے کا کوئی لفافہ بھی لایا ہے؟''

پروفیسر واسطی: ''بھئی مَیں انہیں لفافے میں بند کر کے تقریریں بھیجتا ہوں، وہاں سے التفات بھری مسکراہٹ، اِلاسٹک کی طرح کھنچ جانے والا شکریہ، ایک طرح کی گڈول، سہ ماہی ایک دعوت اور میرا منافع یہ ہے کہ دو ایک ضرورت مند شاگرد کبھی ان کے ہاں، کبھی ان کے ملنے والوں کے یہاں ٹیوشن پڑھانے بھیج دیتا ہوں اور تین، چار کو ان کی کسی نہ کسی فیکٹری میں اپرینٹس شپ مل جاتی ہے، اس طرح یہ تین سو سترہ مردہ اور لجلجے لفظ نہیں رہتے، کچھ زندہ ضرورتوں کے لیے سرمایہ کاری بن جاتے ہیں۔''

سلیم: ''آپ سے میرا ایک سیشن رہتا ہے، میں نے آپ سے انٹیلکچوئل کنزیومرازم (Intellectual Consumerism) پر بات کی ہے، یہ جو ہمارے دانش وروں کی زبان سے طاقتوروں کے ڈِس کورس سے Trickle down ہونے والی ترکیبیں، اصطلاحیں چپک جاتی ہیں۔''

پروفیسر واسطی: ''جیسے انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے، وہ بھی انہی کا Tool ہے، مگر یہ باتیں اب نہیں، آپ دونوں کے لیے بہت بہت دعائیں۔'' (نیلم اور سلیم ہنس کر شکریہ ادا کرتے ہیں)

(نیلم خواجہ اور مسز خواجہ کی تصویریں بناتی ہے، کِلک کِلک، شکریہ)

نیلم: ''آپ دونوں کے چہرے پر تازگی اور اطمینان ہے، حالانکہ آپ دونوں اب ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔''

مسز خواجہ: ''ہم دونوں اتنے مصروف رہے کہ ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کا وقت نہیں ہوتا تھا، پھر مجھے تو بیوٹیشن نے ایک بات سمجھا رکھی تھی کہ ماتھے کے بل اور تیوری سے چہرے پر جھریوں کا جالا بنا جاتا ہے۔''

نیلم: ''خواجہ صاحب آپ کو بھی بیوٹیشن نے یہی سمجھایا تھا۔''

خواجہ: ''نہیں بھئی، یہ مجھ سے زیادہ اچھی تھیں۔''

مسز خواجہ: ''تھیں کیا مطلب؟''

خواجہ: ''تھیں بھی، ہیں بھی اور ہوں گی بھی، یہ حقیقت ہے کہ کوکب ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر تھی، اور ہے، اس لیے میرے دل میں ہمیشہ یہی احساس رہا کہ مَیں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسی بیوی ملی ہے۔''

نیلم: ''یعنی میاں بیوی کو مساوی نہیں ہونا چاہیے خوبصورتی اور وجاہت میں، رتبے اور ثروت میں

طبقاتی پسِ منظر کے لحاظ سے اور ذہنی سطح کے اعتبار سے؟''

خواجہ: ''میرا تجربہ تو کہتا ہے نہیں، مگر مجھے اس کی وجہ سے احساسِ کمتری نہیں ہوا، کوکب نے کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا کہ مجھے یہ احساس ہوتا، بحث مَیں نے کبھی نہیں کی کہ مجھے پتا تھا مَیں مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

نیلم: ''یہ خودشناسی پہلے سے آپ میں تھی یا شادی کے بعد پیدا ہوئی۔''

خواجہ: ''اصل میں میرے اَبا جی بھی خاموش طبع اور خودشناس تھے، اماں کی طبیعت بڑی جلالی تھی، حالانکہ نام ابا جی کا جلال تھا۔''

مسزخواجہ: ''بس جی، یہ بھی میری بات مان کر اپنے لیے اور محبت حاصل کر لیتے تھے، ان کے رشتہ دار اور دوست چھیڑتے بھی تھے، مگر کبھی انہوں نے محض ان پر ثابت کرنے کے لیے مجھ پر حاکمیت جتانے کی کوشش نہیں کی۔''

نیلم: ''آپ کی شادی کب ہوئی؟''

مسزخواجہ: ''بس جی تاریخ سے ان کو دلچسپی تھی، ۲۳ مارچ کو ان سے نکاح ہوا تھا، ۱۴/اگست ۱۹۷۰ء کو رخصتی۔''

خواجہ: ''آپ کو یاد ہے مَیں نے خوشبو میں بھگو کے آپ کو پہلا مکتوب بھی ۱۴/اگست ۱۹۶۹ء کو لکھا تھا۔''

نیلم: 'پھر آپ کی زندگی میں ۶/ستمبر اور ۱۶/دسمبر بھی بھرپور طریقے سے آتے ہوں گے؟''

خواجہ: ''پر جی ۱۴/اگست سب سے حاوی ہے؟''

نیلم: ''۱۴/اگست کو پوری قوم یومِ آزادی کا جشن مناتی ہے اور اس دن آپ نے انہیں لکھا ہوگا کہ مجھے اپنی غلامی میں قبول کریں۔''

خواجہ: ''یہ وہ غلامی ہے، جو ہر غلامی کے اندیشے سے آپ کو آزاد کر دیتی ہے۔''

نیلم: ''اچھا خواجہ صاحب، آپ ہی بولے جا رہے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ مسز خواجہ خاموش طبع ہیں۔''

خواجہ: ''جو مطمئن ہو، وہ کم بولتا ہے۔''

نیلم: ''مسز خواجہ، آپ مطمئن ہیں؟''

مسزخواجہ: ''دیکھئے مطمئن کوئی زندہ شخص تو نہیں ہوتا۔''

نیلم: ''میرا مطلب ہے کہ اب تک جو وقت آپ دونوں پر گزرا، جو دُکھ سُکھ آپ نے مشترکہ طور پر جھیلے، ایک چھت کے نیچے جو زندگی گزاری، محنت کی، کوشش کی، قربانیاں بھی دی ہوں گی۔ اس کے حاصل سے، اس کے ثمر سے مطمئن ہیں؟''

مسزخواجہ: ''دیکھئے ۱۴/اگست کو انہوں نے جو وعدہ مجھ سے کیا، اس سے بڑھ کر نبھایا، اس لیے ہر

۱۴/اگست کو ایک دِیا اُن کے نام اور پیغام کا جلاتی ہوں۔''

نیلم: ''آپ تو کافی رومانوی اور جذباتی دکھائی دیتی ہیں، ایسے لوگ تو stable نہیں ہوتے، میرا مطلب ہے کہ آخر زندگی میں پچھتاوے اور تلخی کے موقع بھی تو آئے ہوں گے۔''

خواجہ: ''وہ جی آئے، ہر نارمل آدمی کی زندگی میں آتے ہیں، مثلاً مَیں نے اپنی والدہ کی جلالی طبیعت کا ذکر کیا ہے، پہلا مسئلہ انہی کے حوالے سے پیش آیا، مَیں بفرزون بن گیا، دونوں شمشیر زن میرے وجود کو کارزار بنانے کے لیے اترتے تھے مگر دونوں ہی میری محبت اور اطاعت سے بھیگ جاتے اور آہستہ آہستہ ان کی تلواروں کو زنگ لگ گیا۔''

مسزخواجہ: ''امتیاز کی یہ بات درست ہے کہ انہوں نے بہت سے شکوے ان کے سن لیے، بعض گِلے مجھ سے بھی، مگر کوشش کی ہم سب کے سب ایک لڑی میں پروئے رہیں، سو ہم پروئے رہے۔''

نیلم: ''امتیاز خواجہ صاحب کے ہر سلوک کو کوئی نہ کوئی فریق تو امتیازی خیال کرتا ہوگا؟

مسزخواجہ: ''ایسا امتیازی سلوک تو خوش نصیبوں سے ہوتا ہے، نیلم، ناراض نہ ہونا اب ایک سوال تم سے کروں، تمہاری شادی ہوئی ہے؟

نیلم: ''جی نہیں بس اسی برس ہو جائے گی۔''

خواجہ: ''میری دعا ہے کہ تمہیں قدر کرنے والا شوہر ملے، ہمارے ہاں مرد کو پہلا سبق یہی دیتے ہیں کہ عورت کو دبا کے رکھو۔ اسے سر پر نہ چڑھاؤ، اور یوں بعض شوہر عورت کی عزتِ نفس کو یا خودداری کو کچلنے کی کوشش کر کے سارا گھر برباد کر بیٹھتے ہیں، امتیاز نے میری قدر کی اور ہمیشہ کے لیے میرے دل میں جگہ بنائی، میری دعا ہے نیلم تمہیں اچھا انسان ملے، You deserve it!''

خواجہ: ''بھئی ہمارے استاد صدیقی صاحب تھے، کہا کرتے تھے میاں شادی تو لاٹری ہوتی ہے، ۹۹۹ پرچیاں خالی اور ایک ہزارویں کامیاب کے نام کی، تو بھئی دعا ہے کہ نیلم کی ہماری طرح ہزارویں پرچی ہی ہو۔''

نیلم: ''آپ کے بچے؟''

مسزخواجہ: ''ہمارے تین بچے ہیں، دو بیٹے، ایک بیٹی، دو ڈاکٹر ہیں، بیٹی نے ایم بی اے کیا، تینوں اب ماشاءاللہ باہر ہیں، states میں۔''

نیلم: ''ناراض نہ ہوں خواجہ صاحب اور مسز خواجہ، یہ آپ کی بطور والدین کامیابی کہ بالآخر آپ کا گھر خالی ہوگیا۔''

خواجہ: ''ایک عرصے سے مڈل کلاس کے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اس طرح تعلیم دیتے ہیں، ہنر سکھاتے ہیں کہ کسی طرح وہ باہر چلے جائیں گے۔''

مسزخواجہ: ''دیکھیں جی، ہماری اولاد صرف ہمارا نہیں ہمارے وطن کا بھی نام روشن کر رہی ہے، جہاں

گئے ہیں، اپنی لیاقت، علم اور تربیت کی دھاک بٹھا رہے ہیں، ہمارا تو سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے، جب ان کا نام کسی رپورٹ میں چھپتا ہے۔''

نیلم: ''میرا مطلب یہ تھا کہ آپ مثالی بیوی ہیں، آپ میں ذہنی ہم آہنگی ہے، ایک دوسرے کے لیے پیار اور احترام لفظوں میں نہیں، آنکھوں اور دلوں میں بھی ہے، اس کے باوجود یہ آپ کی ناکامی کہ آپ کا خالی گھر، یہ سجاوٹ، یہ ڈنر سیٹ، یہ فرنیچر یہ اشیاء آپ کے بعد کی نسل کے لمس کو بھی ترس رہی ہیں؟''

خواجہ: ''دیکھئے، ہمیں بات اچھی لگے یا نہ، یہ حقیقت ہے کہ ہم جیسے لوگ انہیں باہر جانے اور باہر بھجوانے کے لیے ہی تیار کرتے ہیں، دل پر پتھر رکھ کر، انہیں او لیول اور اے لیول کراتے ہیں، ان کے لیے سیونگ کرتے ہیں، ان کے لیے سکالر شپ مینج کرتے ہیں، انہیں اگر اپنے ماں باپ سے اور ہمارے طرزِ زندگی اور وطن سے لگاؤ ہوگا تو فنی طور پر اور معاشی طور پر وہ مستحکم اور توانا ہو کر آخر کار یہاں آئیں گے۔''

مسز خواجہ: ''وہ جی اب تو مَیں انٹرنیٹ پر ان سے chatting کرتی ہوں، کیمرہ بھی نیٹ سے منسلک ہے، وہ مجھے دیکھتے ہیں، مَیں انہیں دیکھتی ہوں۔''

نیلم: (ٹیپ ریکارڈر بند کرتی ہے) ''اچھا خواجہ صاحبان گڈ لک اور شکریہ!''

(نیلم خواب دیکھ رہی ہے)

جنگل کا تاثر، گیڈروں اور کتوں کی آوازیں، بیچ میں اُلو کی بھی آواز

نیلم کی خود کلامی: ''یہ میں کہاں آ گئی ہوں، چاند اک دم سے کیوں بجھ سا گیا ہے، اماں، میری اماں، کدھر چلی گئیں آپ! یہ کیا ہوا سلیم کا موٹر سائیکل اُلٹا کیوں پڑا ہے؟ (ہنستی ہے) پٹرول ختم ہو گیا، پھر سلیم، سلیم، ذرا مسکراہٹ، مسز منور، نہیں نہیں مسز خواجہ پہلے آپ مسکرایئے، ہاں صابرہ تمہارا بھی حق ہے کہ تم مسکراؤ، مونا لیزا کی طرح تمہارے لبوں پر حزن کیوں کھیل رہا ہے؟

مسز منور: ''اصل میں تمہارا قصور نہیں، تم نیچے سے اوپر آئے ہو، تمہاری اماں بھی یہی جاسوسیاں کیا کرتی تھی، اب تم بھی یہی کرتے ہو؟ (شور شرابہ چیزیں ٹوٹنا) دیکھیں جی تیسری دنیا میں نوے فیصدی لوگ نظام کے تابع ہوتے ہیں ہم دس فیصد نظام چلانے والے ہوتے ہیں، ہمارے پاس وسائل ہیں، ہمیں حق ہے کہ اپنے بچوں کو ان دس فیصد میں ہی رکھنے کے لیے تیار کریں۔''

منور: ''وقت بدل گیا ہے، ہم سب بدل گئے ہیں، وہ صبر، شکر، ایثار، قناعت اور سادگی زندگی سے نکل گئی ہے، اس کی جگہ خود غرضی اور منافقت نے لے لی ہے، ہم دونوں کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے فیکٹری مزدوروں کو اپنے نوکروں کو خلوص اور سادگی سے زندگی گزارنے کی تلقین کریں، بس جی انسان تو تلقین ہی کر سکتا ہے، آگے تو عمل کرنے والے پر ہے۔''

نیلم: ''شکریہ، شکریہ منور اور مسز منور، آپ نے مجھے بتایا کہ زندگی میں سب سے زیادہ ولگر، سب سے زیادہ لچر شے دکھاوا اور ریاکاری ہے۔''

ایڈیٹر: ''آپ نے پڑھا؟ دیکھئے آپ دیکھئے، یہ سولہ سرخ نشان ہیں، دیکھیں آٹھ مرتبہ مولانا جلال الدین رومی کے روضے کا لفظ آیا ہے، ہر مرتبہ یہ 'ض' کی جگہ 'ز' سے لکھا ہوا ہے، چار مرتبہ وہاں مامور دربان کا ذکر آیا اور مامور 'ا' کی بجائے 'ع' سے لکھا گیا، جانتی ہیں ناں کہ معمور (ع حلق سے نکال کر) اور مامور میں کیا فرق ہے، روضہ اور روزہ میں کیا امتیاز ہے، میری نظر میں آپ ہی نہیں، آپ کے اساتذہ بھی مشکوک ہو گئے ہیں!''

نیلم: ''بجا کہتے ہیں سر، جس کے پاس نوکری دینے اور نوکری سے نکالنے کا اختیار ہوتا ہے، وہ کبھی بے جا نہیں کہتا، ہمیشہ بجا کہتا ہے، آپ سر ایڈیٹر ہیں، آپ کی تو اپنی آنکھوں کی املاء درست نہیں، پر یہ ہم تو نہیں کہہ سکتے، زیرِ تربیت صحافی۔''

سلیم: ''موٹر سائیکل حاضر ہے، سڑکوں پر، ہسپتالوں میں، بس اڈوں پر، ریل گاڑی میں، قبرستانوں میں، مزاروں میں کہیں نہ کہیں ہمیں مثالی جوڑا مل ہی جائے گا۔''

نیلم: ''اوئے بدشگنے، مثالی جوڑے قبرستانوں اور مزاروں میں کیوں اوئے؟ ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ ابھی تو تمہارا موٹر سائیکل الٹا ہوا پڑا تھا؟ کہاں چلے جاتے ہو اور کہاں سے آ جاتے ہو؟''

سلیم: ''ننھی چڑیا'' چوں چوں بہت کرتی ہے، پر نہیں جانتی کہ یہ چیزیں دلوں سے غائب ہوتی ہیں، پھر گھروں سے کوچ کرتی ہیں، گھروں کے مقفل دروازوں اور رائفل بردار پہریداروں کو بھی پتا نہیں لگتا کہ دلوں کے گھر کیسے خالی ہو جاتے ہیں!''

نیلم: ''سلیم پلیز، پوئٹری نہیں، انشا پردازی نہیں، تقریریں نہیں، پلیز سیدھی سادی بات کہ یہ لیڈیز کلب، یہ مقدس تہوار، یہ فنکشن اس میں آنے والی مہذب شخصیتیں یہ شائستہ، کھنکتے ہوئے لوگ، یہ اندر سے خالی کیوں ہو گئے؟''

صابرہ: ''ڈر زیادہ لگا تھا، مَیں جی رضائیوں والی پیٹی میں چھپ گئی تھی، آواز نکال کر رو بھی نہیں سکتی تھی، پر جی یہ دنیا تو زور والوں کی ہے۔۔۔ مجھ میں بڑا صبر ہے، مجھے جس بی بی نے قرآن مجید پڑھایا ہے، ان میں بھی بڑا صبر تھا، میاں جی بڑے ظالم تھے، سالن میں نمک زیادہ ہوتا تھا تو بی بی کے شاگردوں کے سامنے ان کو مارتے تھے، چونڈے سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیتے تھے، ہم سب کبھی تو اونچی اونچی آواز میں روتے تھے اور کبھی ڈر کے مارے چپ رہتے تھے، مَیں تو جی، جب قرآن پڑھتی ہوں، ساتھ روتی بھی رہتی ہوں، اپنی بی بی کے لیے۔''

رفیق: ''رے، رے، تیں کیا کری جارئی اے، ہُوٹواں پینچ رئی اے، ہماری لُگائی کی، رے تیں جُرت کیسے کی، ہمارے گھر کو بجار بنانے کی؟ مَیں اَن پڑھ جرور اُوں، پر مَیں جانوں رہے تھارے

سارے اَکھباراں کو تم ساری کھبراں برے لوکاں کی دیتے ہو اور کالک مَلتے رہتے ہو اچھے لوکاں کے منہ پر، گھراں میں آگ لگاتے ہو، تم سارے کے سارے، تیں ہوٹو چھاپے گی صابرہ کی، جِس دن، چار گندی نظراں والے اس پر عاسک ہو جاویں گے (رونے لگتا ہے) تو رفیک کی جندگی میں کیا رہ جاوے گا؟''

نیلم: ''میرے پاس کیا ہے؟ ابھی چاند تھا میری ہتھیلیوں میں، ابھی ریت کی طرح ذرہ ذرہ ہو کے نکل گیا، مگر یہ دنیا اچھے لوگوں سے، خیالوں سے، دلاسوں سے، وعدوں سے اور خوابوں سے خالی نہیں ہوئی، بس اسے دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔''

پروفیسر واسطی: ''سارا مسئلہ توازن کھو بیٹھنے کا ہے، بلکہ اس سے بھی پڑھ کر یہ کہ جِس مرکز سے یا نظام سے کوئی معاشرہ توازن حاصل کر سکتا ہے، اس کی ساکھ اور اعتبار جاتا رہا ہے۔ ہم سب اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں، ہر آدمی اس وہم میں مبتلا ہے کہ وہ بہت اچھا ہے، وہ سچا ہے، دیانت دار ہے، با اُصول ہے، منافق نہیں ہے، پر یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے ایسا کہنے، اصرار کرنے کے باوجود اندھیرا بڑھتا جاتا ہے۔''

نیلم: ''سلیم، تم چاند کی طرح میری ہتھیلیوں میں آ کے اور ریت کی طرح پھسل کیوں جاتے ہو، اور یہ کیا ہوا ہے، اتنے لوگ کیوں جمع ہیں، سڑک سے نیچے کھائی میں کیوں جھانک رہے ہیں کیا ہوا ہے؟ کوئی بس گر گئی ہے؟''

مسز خواجہ: بس جی، یہ بھی میری بات مان کر اپنے لیے اور محبت حاصل کر لیتے تھے، ان کے رشتہ دار اور دوست چھیڑتے بھی تھے، مگر کبھی انہوں نے محض ان پر ثابت کرنے کے لیے مجھ پر حاکمیت جتانے کی کوشش نہیں کی۔ ۱۴/اگست کو انہوں نے جو وعدہ مجھ سے کیا، اس سے بڑھ کر نبھایا۔ اس لیے ہر ۱۴/اگست کو ایک دِیا ان کے نام اور پیغام کا جلاتی ہوں۔''

سلیم: ''کنویں جھانکنا آسان ہو گیا ہے، آنکھوں میں جھانگ کر کچھ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے، کروال (Cruel) حقیقت میں ظالم، قاتل مگر بہت ہی خوبصورت، تمہارا غصہ، موت اور مرنے کو بھی پرکشش بنا دیتا ہے۔''

نیلم: بس؟ دعوے کرنا، ڈائیلاگ بولنا، کسی اور کو اپنی ذات پر وارد کر کے بولنا اور بات ہے اور سچ مچ جھیلنا، کسی کے ساتھ مل کر جھیلنا اور بات ہے، رانجھے بس بیٹھے ونجلیاں بجاتے ہیں، مہینوال دریا کے کنارے بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں، پنہوں ڈاچیوں پر لد کر چلے جاتے ہیں، ساری ملامتیں، دریائے تلاطم اور صحرا کے بگولے تم لوگوں نے ہمارے لیے لکھ چھوڑے ہیں۔''

(کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بڑھ جاتی ہیں)

نیلم: ''یہ ہوا کیا ہے، اتنے لوگ کیوں جمع ہیں، سڑک سے نیچے کھائی میں کیوں جھانک رہے ہیں، جس

سرکاری نمبر پلیٹ کی گاڑی نے اس بس کو اوورٹیک کیا تھا، تم مجھے اس کا نمبر تو لکھواؤ، جس کی وجہ سے یہ بس کھائی میں گر گئی سلیم کا موٹر سائیکل پھر اوندھا پڑا ہے۔''

(چیخ مار کے بیدار ہوتی ہے)

نیلم: (سسکیاں لیتے ہوئے) ''اتنا ڈراؤنا خواب، اوہ میرے اللہ۔''

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

نیلم: (اونچی آواز میں) ''اِٹ اِز آل رائٹ، سوتے میں ڈر گئی تھی، تھینکس!''

(ٹیلی فون ملاتی ہے، دو تین مرتبہ، پھر موبائل پر رابطہ ہوتا ہے)

نیلم: ''سلیم، کہاں ہو تم، مَیں نیلم ہوں، تم کہاں ہو؟''

سلیم: ''مَیں تمہاری دعائے نیم شبی کے سائے میں اس وقت ائیر کنڈیشنڈ بس میں آہِ سحر گاہی کے لیے بیٹھا ہوں۔''

نیلم: ''ڈونٹ ٹاک نان سینس، سنو میری بات غور سے سنو، تم بس سے اُتر جاؤ، میں نے اک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔''

سلیم: ''ہم تم مل کر توہمات اور ضعیف الاعتقادیوں سے آزاد زندگی گزارنے کا خواب دیکھ رہے ہیں، کیا ہوا ہے تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم روئی ہو۔''

نیلم: ''ہاں سلیم میں روئی ہوں اور ابھی اور روؤں گی، اگر تم بس سے نہ اُترے تو۔''

سلیم: ''نیلم میری جان، یہ بس لاہور سے پنڈی جا رہی ہے، ماں کو لینے جا رہا ہوں، تم سے ملوانے کے لیے، ہم دونوں نے بڑے مشکل مشکل کام کیے ہیں، یہ تو بہت آسان ہے ایسے گیا اور ایسے آیا۔''

نیلم: ''تم ٹالو نہیں، بس سے اتر جاؤ''۔

سلیم: ''نیلم تم اس کمپنی کو جانتی ہو' یہ مقررہ سٹاپ سے پہلے نہیں رکتی، پندرہ منٹ کے بعد اس کا سٹاپ آنے والا ہے۔''

نیلم: ''بس اسی سٹاپ پر اُتر جاؤ۔''

سلیم: ''وعدہ، میں اسی سٹاپ پر اُتر جاؤں گا، مگر وہاں پہنچنے کا وعدہ کرو۔''

نیلم: ''میرا انتظار کرو، وہاں مَیں خود آؤں گی، یا میرا پیغام آئے گا۔''

ٹی۔ وی آن کرتی ہے، ایک گانا سنوایا جا رہا ہے، تھوڑا وقت گزرنے کا تاثر جائے گا اور پھر نیوز ریڈر بریکنگ نیوز کے ساتھ۔

''آج ایک مسافر بس لاہور سے پنڈی جاتے ہوئے موٹروے پر حادثے کا شکار ہو گئی۔ بس گہری کھائی میں گر گئی ہے، ابتدائی اطلاعات کے مطابق ۱۱۱ اموات ہوئی ہیں۔''

☆☆☆

ڈاکٹر عقیلہ بشیر

گچرا

سیمی خالہ کا نام میری شخصیت سے کچھ یوں چپکا ہوا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ میری شخصیت کو ادھورا بناتا ہے یا مکمل۔ سیمی خالہ میری امی سے بہت چھوٹی تھیں۔ امی کی شادی ہوئی تو ایک طرح سے جہیز میں ساتھ آئیں۔ امی فیصل آباد سے جو اُس وقت لائل پور تھا بیاہ کر کوئٹہ گئی تھیں ایسے میں اپنوں سے دوری اور امی کی تنہائی کا سوچتے ہوئے نانا ابو نے سیمی خالہ کو امی کے ساتھ ہی بھیج دیا۔ ویسے بھی دونوں بہنوں میں بے تحاشا پیار تھا۔ ابو نے بھی سیمی خالہ کو اپنی بڑی بیٹی کا درجہ دیا۔ لہذا جب میں پیدا ہوئی تو اکلوتی ہونے کے باوجود ایک عدد خالہ کی صورت میں بڑی بہن موجود تھی۔ شاید تقدیر نے بھی اسے سچ ہی سمجھا کیوں کہ جب میں نے ہوش سنبھالا اور اپنی شخصیت کے حوالے سے جو پہلا جملہ میرے کانوں نے سنا وہ یہ تھا:

بینا! تو بالکل سیمی جیسی ہے۔ وہی ناک نقشہ وہی آنکھیں، البتہ بال اپنے ابو کی طرح گھنگریالے ہیں، پتہ نہیں کیوں مجھے یہ جملہ کبھی اچھا نہ لگا۔ میں تو امی جیسا لگنا چاہتی تھی لیکن امی کتنی کنجوس نکلیں اُن کی ایک چیز بھی میرے حصے میں نہ آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے حقیقت کو قبول کر لیا۔ میرے لڑکپن میں سیمی خالہ اپنی جوانی میں قدم رکھ چکی تھیں اور جب کوئی اُن کے دلکش سراپے کی تعریف کرتا تو مجھے یوں لگتا یہ تعریف سیمی خالہ کی نہیں بلکہ میری ہو رہی ہے۔ آخر تو میں اُن جیسی ہوں اور پھر سیمی خالہ مجھے اچھی بھی تو کتنی لگتی تھیں، بالکل کڈبری کی چاکلیٹ کی طرح۔ ان کی رنگت بادام کے شگوفوں کی مانند تھی اور رخسار خوبانی کے شگوفوں جیسے۔

ہمارا گھر لیٹن روڈ پر تھا۔ انہی دنوں ہمارے ساتھ والی کوٹھی میں ایک صاحب لاہور سے ٹرانسفر ہو کر آئے۔ ان کی تنہائی کو دیکھتے ہوئے ابو عام طور پر شام کی چائے پر یا کبھی کبھار کھانے پر بُلا لیتے۔ جب بھی فہیم صاحب آتے سیمی خالہ میرا ہاتھ زور سے پکڑ کر دباتیں مجھے محسوس ہوتا کہ ان کے ہاتھوں کی نمی میری ہتھیلی میں منتقل ہو گئی ہے۔ فہیم صاحب کو چائے پکڑاتے وقت اُن کی رنگت مزید گلابی ہو جاتی۔ ایک روز سیمی خالہ نے مارکیٹ سے ایک چھوٹا سا خوبصورت پرس لا کر مجھے دیا۔

بینا! یہ پرس میں تمھارے لیے لائی ہوں، اسے سنبھال کر رکھنا۔

اتنا خوبصورت پرس۔ شکریہ سیمی خالہ! میں نے پرس پر قبضہ جماتے ہوئے کہا،

ایک روز جب فہیم صاحب ابو سے مل کر واپس گئے تو سیمی خالہ میرا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں

اور صوفے پر اُسی جگہ بیٹھ گئیں جہاں کچھ دیر پہلے فہیم صاحب بیٹھے تھے۔

''بینا! میں نے جو پرس تمھیں دیا تھا اُس میں کیا رکھا ہے؟

''کچھ نہیں سیمی خالہ! ابھی تو چند روپے ہوئے ہیں'' اور ذہنی طور پر تیار ہو گئی کہ اب سیمی خالہ مزید روپے دیں گی۔

''اوں ہوں! یہ بھی کوئی رکھنے کی چیز ہے۔ دیکھو ناں روپے پیسے تو آپا، میں اور سب ہی پرس میں رکھتے ہیں۔ تمھیں کچھ اور رکھنا چاہیے۔

کیا؟ میں نے تجسّس سے پوچھا

مثلاً: یہ۔ انھوں نے ایش ٹرے سے بجھے ہوئے سگریٹ کے چند ٹکڑے اُٹھائے انھیں اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ہولے سے سہلایا۔

مجھے بھی یہ اچھوتا خیال اچھا لگا۔ میں بھاگ کر اپنا پرس لے آئی اور پرس میں وہ ٹکڑے احتیاط سے رکھ دیئے۔

بینا! تمھیں یہ فہیم انکل کیسے لگتے ہیں۔ سیمی خالہ نے کیوٹیکس کھرچتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا

''فہیم انکل نہیں، سیمی خالہ فہیم صاحب کہیں۔

''لیکن وہ تم سے بہت بڑے ہیں۔ سیمی خالہ نے پیار سے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا

نہیں! جو آپ انھیں کہتی ہیں وہی کہوں گی

چلو یونہی سہی! لیکن بتاؤ تو وہ کیسے لگتے ہیں

میری نظروں کے سامنے سنہری بالوں والا خوبرو شخص آ کھڑا ہوا۔ جس کی آنکھوں میں شہد سا گھلتا تھا۔

ہاں خالہ! وہ تو شہزادوں جیسا ہے۔ ان دنوں میں الف لیلہ بہت شوق سے پڑھتی تھی اور سارا دن شہزادی، شہزادوں اور جنوں پریوں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

اور اس رات جب میں سیمی خالہ کے ساتھ لیٹی تو کہانی سنانے کی بجائے انھوں نے ''اِک پریوں کا شہزادہ'' گیت سنایا۔

آہستہ آہستہ فہیم صاحب ہمارے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گئے۔ ایک روز جب میں ہوم ورک کر رہی تھی وہ میرے پاس آئے اور قریب بیٹھ کر مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ میری آنکھوں پر اُنگلی پھیر کر بولے۔

''بینا! تمھاری آنکھیں تمھاری سیمی خالہ جیسی ہیں''

میں نے خوش ہو کر پوچھا

''کیا میں آپ کو سیمی خالہ جیسی لگتی ہوں''

انھوں نے بالکل سیمی خالہ کی طرح میرے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا
''تمہیں تم سیمی سے اچھی ہو مگر سیمی نہیں ہو''
''ایک کام کرو یہ بُندے اپنی سیمی خالہ کو دے دینا''
میں نے بُندے لے لیے اور جب سیمی خالہ کو دیئے تو ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور پھر جُھک گئیں
''بینا! یہ بھی اپنے پرس میں رکھ لو۔
اور میں نے جلدی سے پرس نکالا کہ کہیں سیمی خالہ کا ارادہ نہ بدل جائے۔
اِسی طرح ایک روز جب فہیم صاحب اپنا قلم میز پر چھوڑ گئے تو وہ قلم بھی میرے پرس میں سنبھالا گیا اور پنسل تراشتے ہوئے جب ایک روز فہیم صاحب کی اُنگلی پر زخم آیا اور وہ اپنے رومال سے زخم صاف کر کے اُسے میز پر ہی چھوڑ کر چلے گئے تو سیمی خالہ نے چپکے سے وہ رومال بھی میرے پرس میں رکھ دیا۔

وقت تیزی سے گزرا جن دنوں میں نے کالج میں ایڈمیشن لیا ان دنوں سیمی خالہ نے کالج کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا پرس فہیم کی چیزوں سے پُر ہوتا گیا اور میرا دل نجانے کس طرح فہیم کی محبت سے بھر گیا۔ اب میں اور سیمی خالہ دونوں مل کر فہیم کی راہ تکتیں۔ ہم دونوں مل کر راتوں کو جاگتے اور فہیم کی باتیں کرتے اور کبھی کبھی پرس سے تمام چیزیں نکالتے، دیکھتے اور پھر احتیاط سے رکھ دیتے۔ امی نے اپنی بہن کے دل کا حال تو جان لیا لیکن اپنی بیٹی کے جذبات نہ سمجھ سکیں۔

اور ایک روز ابو سے سیمی خالہ اور فہیم کے رشتے کی بات کی۔ میرے پاس سوائے اِس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ سیمی خالہ سے اپنی محبت کی بھیک مانگوں۔
میں نے پہلی مرتبہ سیمی خالہ کے سامنے نظر جھکا کر ہچکچاتے ہوئے کہا
''سیمی خالہ! فہیم صاحب مجھے اچھے لگتے ہیں''
''پگلی وہ تو مجھے پہلے ہی پتہ ہے'' سیمی خالہ زور سے ہنسیں۔
''تو پھر آپ اُن سے شادی مت کریں''
سیمی خالہ ایک لمحے کے لیے مجھے ہلدی کی گانٹھ دکھائی دیں اور دوسرے لمحے انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔
''ارے مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ میری بینا تو بڑی ہوگئی'' انھوں نے کانپتے ہوئے لبوں سے میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور کہنے لگیں
''چندا میں اور تم تو ایک ہی ہیں۔ فہیم سے شادی میری نہ سہی تمھاری سہی۔ اتنی سی بات؟
اور پتہ نہیں اتنی سی بات کے لیے سیمی خالہ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے۔

اگلے روز سیمی خالہ امی سے کہہ رہی تھیں
آپا! اتنا عرصہ آپ کے پاس رہی اب دل چاہتا ہے کچھ عرصہ امی کے ساتھ بھی رہوں۔ لہذا مجھے لائل پور بھجوا دیں اور جب امی نے اُن سے شادی کی بات کی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور امی اپنے اندازے کی غلطی پر ابو کے سامنے کئی روز شرمندہ رہیں۔

سیمی خالہ کے جانے کا جہاں مجھے افسوس ہوا وہاں اطمینان بخش آسودگی بھی نصیب ہوئی۔ اب میں اور فہیم بیشتر وقت اکٹھا گزارتے اور تمام وقت سیمی خالہ کی باتیں کرتے۔

انہی دنوں اچانک لائل پور سے خط آیا کہ سیمی خالہ بہت بیمار ہیں۔ ہم افراتفری میں وہاں پہنچے مگر وہ اس سے پہلے کہیں اور پہنچ چکی تھیں۔ وجہ میں نے آج تک کسی سے نہیں پوچھی کیوں کہ جو وجہ مجھے معلوم تھی وہ کسی کے علم میں نہیں تھی۔
ابو تو جلد کوئٹہ واپس چلے گئے جب کہ ہم چھ ماہ فیصل آباد میں رہے۔
جب واپس آئے تو ابو کے الفاظ میرے کانوں میں پڑے جو وہ امی سے کہہ رہے تھے:
''وہ تو اچھا ہوا رشتہ طے نہ ہو سکا مجھے تو اَب پتہ چلا ہے کہ فہیم کی یہ خاندانی بیماری ہے اس کے دو بھائی پہلے سے مینٹل ہسپتال میں ہیں اور ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کسی صدمے یا حادثے کی صورت میں یہ بھی دماغی توازن کھو سکتا ہے۔ دراصل جراثیم تو اس میں پہلے ہی تھے''
''یا اللہ کس کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے''
امی سے پوچھا تو پتہ چلا۔ فہیم پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ تھوڑی دیر کو تو یوں لگا یہ دورہ فہیم پر نہیں خود مجھ پر پڑا ہے کیوں کہ میرا دل چاہ رہا تھا اتنی زور سے چیخوں کہ میرا جسم ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جائے اور پھر اس سے بھی زیادہ زور سے چیخوں حتیٰ کہ ایک ایک ذرہ اکٹھا ہو کر سیمی خالہ اور فہیم کی صورت میں ڈھل جائے اور درمیان سے میرا وجود مٹ جائے۔ یا دونوں وجودوں میں تقسیم ہو جائے لیکن نہ ہی کوئی چیخ نکلی اور نہ ہی فہیم اور سیمی خالہ کا وجود یکجا ہوا نہ میرا وجود نظروں سے اوجھل ہوا۔

میں دل میں ایک عزم لے کر ہسپتال گئی۔ فہیم صاحب پلنگ پر سیدھے لیٹے تھے اُن کی آنکھوں میں شہد کی جگہ بھورا پن نمایاں تھا۔ سنہری بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے لیکن اُن میں چمک غائب تھی۔ دونوں ہاتھوں میں لوہے کے کڑے پہنا کر پلنگ کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ ورنہ ہاتھ اپنے سینے پر زور زور سے مارتے اور نڈھال ہو کر بے ہوش ہو جاتے۔ کبھی کبھی بجلی کے جھٹکے بھی دیئے جاتے۔

جب میں اُن کے سامنے کھڑی ہوئی تو نقاہت سے آنکھیں کھولتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک آئی۔
تُم کون؟

بمشکل اُن کے منہ سے نکلا۔

''میں۔ میں سیمی ہوں''۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

اُن کا ہاتھ میرے سر پر چپت لگانے کے لیے ہلکا سا اٹھا لیکن بندھا ہونے کی وجہ سے دوبارہ اپنی جگہ پر آ گیا۔

''نہیں! تم اُس سے اچھی ہو

مگر! تُم سیمی نہیں ہو

یہ کہہ کر انھوں نے آنکھیں موند لیں اور سر کو دائیں بائیں جھٹکا دینے لگے

''یہ کہاں دیوانہ ہے۔ ہاں کسی کے لیے دیوانہ ضرور ہے۔''

گھر آ کر میں امی کے گلے لگ کر رونے لگی

''امی لوگ جھوٹ بولتے ہیں میں سیمی خالہ جیسی نہیں ہوں''

''نہیں چندا تم سیمی سے زیادہ اچھی ہو۔ امی نے مجھے بہلایا

لیکن اس بہلاوے نے مجھے اور رُلایا

پھر سیمی خالہ اور فہیم صاحب وقت کی دھند میں اوجھل ہوتے گئے

کل جب میں اپنی بیٹی کے کپڑوں کی الماری درست کر رہی تھی تو اُس کا پرس میرے ہاتھ میں آ گیا

میں نے اُسے کھولا تو چند سگریٹ کے ٹکڑے میرے ہاتھ میں آ گئے۔

چھن سے میرے اَندر کچھ ٹوٹ گیا

گولڈی! میں چیخ پڑی

اور جیسے ہی وہ میرے سامنے آئی۔ تڑاخ سے ایک تھپڑ میں نے اُس کے منہ پر جڑ دیا

''یہ پرس میں رکھنے والی چیزیں ہیں؟ میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا

گولڈی نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور سسکیاں لیتے ہوئی بولی

مما! پچھلی مرتبہ جب کوئٹہ گئے تھے تو نانو نے یہ پرس مجھے دیا تھا کہ تمھاری مما اس سے کھیلا کرتی تھیں۔ مما! میں تو اِسے کہیں رکھ کر بھول گئی تھی۔ اِسے تو میں نے کھولا ہی نہیں

یکدم دو شہد بھری آنکھیں میرے سامنے آ گئیں۔

اور گولڈی سے نظریں چراتے ہوئے میں اُسے صرف یہ کہہ سکی

''یہ پرس لے لو اور اس میں سے تمام کچرا نکال کر باہر پھینک دو''

☆☆☆

لیاقت علی

پھانس

رات دو، دو بجے تک ٹی۔ وی دیکھتے رہنے یا شہر بھر میں یونہی آوارہ گردی کے بعد سونے میں کیا حرج ہے؟ ہاں مگر صبح جلدی اُٹھنا پڑ جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ناگہانی آفت ہو مگر متعین وقت پر آن دھمکتی ہو۔ ابا کو بھی تو سو بار کہا ہے کہ اس عمر میں گھر سے بس سٹاپ تک پہنچنے میں دوسروں کو بھلے ہی پانچ منٹ لگیں، آپ کی سست روی کو پندرہ منٹ درکار ہیں۔ پر وہ ہیں کہ کسی پرانے فلمی ہیرو کی طرح یہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں کہ اب انہیں بہر حال مرکزی کردار ملنے سے رہا اسی لئے ضمنی کردار لے لینے ہی میں عافیت ہے۔

ہر دوسرے روز اپنی اکھڑی ہوئی سانس کے ساتھ پہلی آواز قدرے آہستہ سے میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ ادھر کوئی جنبش نہ پا کر ایک کڑکتی ہوئی غصے سے بھری پکار برآمد ہوتی ہے تو متعین آفت کی آمد کا پتہ ملتا ہے۔ ہڑبڑا کر میں آنکھیں کھولتا ہوں تو یہ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ آج پھر آؤٹ ڈیٹڈ (Out dated) ہیرو مرکزی کردار کی ضد میں ضمنی کردار (Side role) سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ لہٰذا اب پانچ کوس سائیکل کی پچھلی نشست پر کالے کوٹ میں ملبوس فائلوں کا پلندا تھامے ابا مجھے کوستے جائیں گے کہ کچھ کر لیتے تو مجھے کم از کم اس عمر میں یوں کچہری کے پھٹوں پر ذلت تو برداشت نہ کرنا پڑتی۔ ہاں پہلے پہل مجھے یہ باتیں کچھ ناگوار بھی گزرتی تھیں اور شرمندگی کا احساس بھی پیدا ہوتا تھا پر اب یہ بھی رات دیر تلک مقصد سے عاری آوارہ گردی کی مانند وہ معمول بن گئی ہیں جو کسی بھی احساس سے عاری، مگر ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھار کھانے کے دوران اسی نوع کی کوئی بات یاد آ جائے تو پھر کھانے کا مزہ باقی نہیں رہتا۔ اماں آج تک یہ نہیں سمجھ پائیں کہ بھوک کا واویلا کر کے لی جانے والی روٹی دو تین نوالوں ہی میں بھوک کیسے مٹا سکتی ہے؟

کوئی عشق کی کارگزاری لگتی ہے رضیہ بی!

پڑوسن خالہ اپنے تجربے کا نچوڑ اماں کے کانوں میں سرگوشی سے انڈیلتی ہیں تو نکمے پن پر عاشقی کا بھوت اکھڑے ہوئے صحن پر یوں ناچنے لگتا ہے کہ اماں آنکھیں بھینچ بھینچ کر یہ تعین کرتی رہتی ہیں کہ جو دیکھ رہی ہیں نظر کا دھوکہ ہی ہے نا؟ اللہ نہ کرے کہیں سچ!

''کہاں سچ ہے ماں''؟

مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔

چلو یونہی سہی۔ میری ندامت کا اقرار بجائے خود ندامت کے خالہ کے عاشقی کے فلسفے میں چھپ جائے تو کیا برا ہے؟ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ گھٹیا برانڈ کے سگریٹ، نہ ڈھنگ کا کپڑا نہ کھانا، ایک پرائی بائیسکل، پلاسٹک کی بوسیدہ پھولی ہوئی سوفٹی جو زمین پر پڑنے اور اُٹھنے ہر دو مرتبہ ایک نئے انداز کی دہائی سناتی ہے۔ پھس۔۔۔چاں۔۔۔چاں۔۔۔پھُس اور نذیر صاحب بی۔اے۔ سیکنڈ ڈویژن دعویٰ ہتک کے حق دار سائیکل کی پچھلی سیٹ پر ابا کو لادے شہر بھر کی توجہ کا مرکز بنے جا رہے ہیں کچہری۔ اور اماں کو خدشہ ہے راستے میں پڑنے والے لڑکیوں کے کالج کی لڑکیوں سے عشق کا!

''نجانے کس حرامزادی نے ایسا بنا دیا ہے اسے؟ اللہ پوچھے اُس ڈائن سے جس نے میرا ایسا شہزادہ نگل لیا''!

لو ایک اور لطیفہ۔۔۔شہزادہ، ہاہا۔۔۔ہاہا۔

شہزادے کا اغوا۔۔۔بادشاہ کی دھمکی۔۔۔تاوان کی فرمائش، آخر میں منت سماجت۔

خدا کے لئے ہمارے ولی عہد کو بخش دو بارش آنے والی ہے مابدولت نے چھت کی لپائی کرنی ہے۔ شہتیر کے نیچے سہارے کے لئے ایک اور شہتیر دینا ہے۔

خدا کے لئے۔۔۔اے ڈائن اللہ کے واسطے۔

ہونہہ۔۔۔ہاہا۔۔۔ہاہا۔۔۔

یہی کمال ہے اماں کا بھی۔

''کوئی نوکری ووکری کر لے ہڈحرام دو سال ہوئے بی۔اے کر کے سڑکیں ناپتا پھرتا ہے سُور کے بچے۔''

ہاں اب گرمیوں میں اتنا غصہ تو برداشت کر ہی لینا چاہیے وہ بھی پبلک ٹرانسپورٹ میں کوٹ اور عزت دونوں سنبھالتا جب کوئی دوسرے درجے کا وکیل گھر لوٹے تو اتنا غصہ تو انتہائی فطری امر ہے۔ ضرور برداشت کر لینا چاہیے۔

چلو کر لیتے ہیں جناب نذیر صاحب، کوئی حرج نہیں۔ پر دلوا دیجیے نا کوئی نوکری، ابا حضور!

آپ نے تو زندگی گزاری ہے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ۔

بڑے۔۔۔بڑے لوگ۔ ہاہا۔۔۔ہاہا۔۔۔پھر ہنسی آتی ہے ابا کے دعوؤں پر۔

عمر گزار دی پر اتنا نہیں جان سکے بھلا بڑے لوگوں اور چھوٹے لوگوں میں بھی دوستی کا رشتہ ہو سکتا ہے؟

ہاں شفقت کا، فرمانبرداری کا، احسان کا یا برخورداری کا رشتہ ہو سکتا ہے۔

کیسے ہاتھ باندھے ابا نے آخر، کلف لگے سوٹ اور ویسٹ کوٹ میں چھپی نام نہاد عزت کو ایک طرف رکھتے ہوئے برابری کے تعلق داروں کے آگے۔

سالے۔۔۔حرامی۔۔۔منہ بولے چچا۔

ابا سینہ تان کے نسبت بیان کرتے نہیں تھکتے تھے۔

گھر میں بھلے کچی املی کھانے کو نہ ملے گرمیوں میں ایک ایک پیٹی بھیجتے تھے۔ انور راٹول کی اور سردیوں میں بھیجے جاتے تھے تازہ سوہن حلوے کے بڑے ڈبے برابری کے تعلق داروں کو۔

کون سمجھائے اب انہیں کہ فقط شہر نہیں پھیل رہے اِن حرامیوں کے پیٹ بھی روز بروز اسی طرح پھیل رہے ہیں۔ اب پھیلے ہوئے شہر کے کسی کونے میں تعلق کی نشانی کوئی اکلوتی آموں کی پیٹی دھری بھی ہو تو کون دیکھتا ہے؟

پھر غصہ کیا!

ہاں غصہ تو آنا ہی تھا۔

پجارو کی پچھلی سیٹ پر فائلیں تھامے ابا ساتھ جو جاتے تھے دوست بن کر تعلق داروں کی بڑی محفلوں میں۔

اب انہیں کس نے کہا تھا کہ سرگوشیاں سنتے پھریں۔

منشی ہیں؟

شی۔۔۔شی! ہاں

نئے ہیں؟

کیسے اثبات میں سر ہلایا منہ بولے بھائی نے ابا کے۔

غصہ نہیں آنا تھا تو اور کیا آتا تھا؟ مجھے تو سن کے قے آئی کیسے دھکے کھاتے نکلے بڑے پھاٹک سے باہر۔

اب سائیکل سے پجارو میں چھلانگیں لگائیں گے تو ایسا تو ہوگا ہی۔

ہاتھو! کیسے زور سے گلے کے نیچے تک سے بلغم کھینچ کے گیٹ پہ مارا اور زناٹے کا تھپڑ کھایا واچ مین سے۔ پر واچ مین کے دانت کیا میں نے نہیں توڑ ڈالے؟ یہی ہوا نہ کہ دو چار ماہ جیل میں گزارنے پڑے۔ گھر سے تو اچھا کھانا ملتا رہا۔ اوپر سے سائیکل پر ابا کو بھی ہر دوسرے روز کھینچ کر کچہری نہیں جانا پڑا۔ اب کہتے ہیں نوکری نہیں کرتا۔ یونہی تھپڑ کھاتے پھریں گے تو کر لی میں نے نوکری۔

جیل ہی راس آئے گی یا رات کی آوارہ گردی۔ تین روپے کی چائے پر چھ گھنٹے ہوٹل کی بوسیدہ کرسیوں پر غلاظت اگلتے لفظوں کے ساتھ سبھی کو رگیدتے ہوئے۔

سبھی کی پگڑیوں سے فٹ بال کھیلتے ہوئے۔

یہ گول۔۔۔ہاہا۔۔۔لو ایک اور گول۔۔۔ایک اور۔۔۔

اوپر سے اماں کو بھی سارے جہان سے نرالا اپنا بھانجا عفی نظر آتا ہے۔

کیا دوست نہیں تھا وہ میرا؟

ہم جماعت، ہم نوالہ، ہم پیالہ۔

کیسی کیسی ماریں کھائیں اور پھینٹیاں لگائیں میں نے اُس کی خاطر۔ شہر بھر کی سڑکیں اکٹھے ناپیں، کبوتر پالے نہروں نہائے، فلمیں دیکھیں، تھیٹر جھانکے، کارڈ کھیلے، پی۔ ایس ایف کے سٹکر سینے پر ٹھوک کے سجائے کالج میں، بنا ٹکٹ ریل سفر کئے۔ گانے گا گا کر سنائے اک دوجے کو، ہر عید پر ایک جیسے جوڑے بنوائے۔ بڑھ چڑھ کے مثالیں دیں لوگوں نے دوستی کی۔ خود اماں بھی تو نہیں تھکتی تھیں۔

پر اب! اب وہ حرامی بلی کیا انسپکٹر بنا کہ دو چار دفعہ بے تکلفی سے دفتر جا گھسے تو گشت کا بہانہ بنا کر اٹھ گیا۔ فون کئے تو کہلوانا شروع کر دیا صاحب دفتر میں نہیں ہیں۔

صاحب!

دو سنوائیں سالے کو کھری کھری اور اوقات یاد دلوائی تو جو ڈھکی چھپی عزت اور بھرم باقی تھا اُسے بھی ایک طرف رکھا اور یوں گرج کے دفتر سے نکالا گویا نہ نکالا تو حوالات میں بند کروا کے چھتر ول کروائے گا لمبے چھتر سے۔

مجھے انسپکٹری کا ٹیسٹ یاد آ گیا۔

کیسا بھیکی بلی بنا آتا تھا میرے پاس مضمون لکھنے کے گُر سیکھنے۔ میں بیمار کیا پڑا کہ سمجھا وہ زیادہ ذہین فطین ہے۔

کتنے کا بچہ، حرامی۔

اب بھولے کی بھی سن لو۔

برف بیچتا تھا گرمیوں میں۔

ایسا بلند ہوکا لگاتا کہ برف گھروں کے کمروں میں بیٹھے کانوں میں پگھلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ فریج ہر گھر میں کہاں تھا اُس وقت۔ کولر پکڑے سارے محلے کے لڑکے بانکے نکل کھڑے ہوتے۔ عفی اور مجھے دو دو ڈلیاں اضافی ڈال کر دیتا۔

کہتا تم دونوں پر جڑواں ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اتنی مشابہت کزنوں میں؟ بس اس بات پر اتنا مسرور ہوتا کہ علی اعلان دو دو ڈلیاں زیادہ دیتا۔ تبھی تو ہمسائی خالہ منت کرتی کہ برف کوئی تم دونوں میں سے لا دیا کرے مجھے بھی۔

''اور تیرا یہ موٹا پلاسُور، کیا صرف کھانے کے لئے ہے گھر میں؟''

میں کہاں چپ رہنے والا تھا۔

ہاں عفی خوشامد میں کولر لئے نکل کھڑا ہوتا۔ ''بس خالہ آپ گھر چلیں میں برف لے کے ابھی آیا۔''

اور خالہ واری صدقے جاتیں عفی کے۔

بُرا میں ہی ٹھہرتا۔۔۔ بدزبان۔۔۔ بدلحاظ۔

اب کیا بتاتا خالہ کو کہ اُس پھدکتی لومڑی کو سنبھالو جو چھپ چھپ کے عفی کو خط میں شعر لکھ کر دیتی ہے۔ وہ برف لینے کی تابعداری مفت میں تھوڑا ہی کرتا ہے۔ پانی والے غبارے مزے لے لے کر مٹھی میں دبا دبا کے کہتا ہے مجھے

دبا نا ذرا۔۔۔ پلیز ایک بار تو دبانا۔

ہاں ایسے ہی ہیں اُس ہرنی کے بھی۔

مزہ آ جاتا ہے یار۔

''عفی بڑا اچھا ہے بہن تیرا بیٹا تو بڑا ہی بدلحاظ ہے۔''

''بڑا ہی بدلحاظ ہے''

ابھی بتاؤں نا پانی والے غبارے دبا دبا کے موٹی بھینس کو تو بدکتی پھرے پورے محلے میں۔

بھولا بھی کہتا ہے ہو تم دونوں ایک جیسے بس نذیر ذرا ترش ہے، کڑوا ہے زبان کا۔

اُسے بھی نہیں پتہ کہ اُس کی گیلی ٹھنڈی بوری کے نیچے سے روپے روپے والے سکے کون سرکاتا ہے؟

بتا دوں نہ اُسے بھی تو بلاک پھوٹیں عفی کے سر پر۔ پر اپنی ایسی عادت نہیں کہ اپنا مطلب نکالنے اور اچھا کہلوانے کے لئے دوسروں کو بے عزت کرواتے پھریں۔

پر اب خیال آتا ہے چلتا ایسا ہی ہے۔

رائج کرنسی یہی ہے۔

مال اسی سے ملتا ہے۔

دس سال ہو گئے تھے بھولے کو دیکھے۔ کچھ روز ہوئے گھنٹہ گھر سے یونہی گزرتے ہوئے دیکھا تو کوتوالی کے سامنے کھڑا آلو بھی بیچ رہا تھا۔ میں نے پہچان لیا۔

اُس نے بھی خوب پہچانا۔

دوڑ کر بغل گیر ہوا۔

بوتل، شربت، رس ملائی، کیا کیا چیزیں بھاگ کر لینا چاہیں۔ زبردستی روکا پر کہاں رُکا۔

دہی بھلوں کی پلیٹ اور بوتل لے ہی آیا۔

کیا حال ہیں؟ کیسے ہو؟

ٹھیک ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔

تو سنا کیسی گزر رہی ہے؟

ہاتھ باندھ لئے۔بس ادھر بھی کرم ہے اُس ذات کا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کے پانچ سات دوستوں کو اکٹھا کرلیا۔

دوست ہیں میرے۔ دن میں یہیں چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں رات کو رضا کاری کی ڈیوٹی دیتے ہیں شہر بھر میں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں۔

اچھا کرتے ہو۔ میں نے کہا۔

سبھی رضا کار جواب تک محض بھولے کی وارفتگی اور محبت دیکھ رہے تھے اب متمنی تھے کہ یہ بھی تو پتہ چلے کہ یہ صاحب ہیں کون؟

''اپنا بچپن کا یار عفی ہے۔''

بھولے نے سینہ تان کے کہا۔

''آج کل انسپکٹر بھرتی ہوگیا ہے پولیس میں۔ پر دیکھ لو بھولے کو اب بھی نہیں بھولا۔ سپیشل ملنے آیا ہے۔''

مجھے کھانسی آ گئی۔ دہی بھلا کوئی پھانس بن کر گلے میں شاید اٹک گیا تھا۔

انہماک سے اس سارے تعارف کو سنتے ایک رضا کار نے دوڑ کر پانی کا گلاس مجھے تھمایا۔ میں نے پانی کے دو گھونٹ لئے اور آنکھوں میں آئے پانی کو بازو کی کف سے صاف کر کے دیکھا تو سبھی رضا کار یوں ہوشیار تھے گویا ابھی ابھی سلیوٹ مارنے والے ہوں۔

اُدھر بھولا مزے لے لے کر اور بڑھا چڑھا کر بچپن کے سارے واقعات انہیں سنا رہا تھا اور وقفے وقفے سے میری تائید بھی لے رہا تھا۔

اب میں بھلا کیا کہتا کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو اُس نے تو موقع ہی نہیں دیا۔

کہاں ہو آج کل عفی میاں؟

آج کل؟

مجھے پرانے ہوٹل کی بوسیدہ کرسیاں اور اپنے کمرے کی وہ الانی چارپائی یاد آ گئی جو روز میں عین پنکھے کے نیچے رکھ کر جاتا ہوں اور ابا اُسے دیوار کے ساتھ لگا کے اپنی چارپائی پنکھے کے نیچے ڈال لیتے ہیں۔

خانیوال۔۔۔خانیوال۔ میں نے عفی کی پوسٹنگ ذہن میں لاتے ہوئے جواب دیا اور کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر جلد از جلد وہاں سے رخصت چاہی۔

مجھے عفی سمجھ لیا اُس نے

ہاہا۔یعنی کمال ہے بھولے کی بھی ماں

''تبھی تو اتنی عزت دی تجھے اُس نے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں۔۔۔۔ میں نے اماں کی اگلی

بات نہیں سنی۔ سالے نے مجھے یہ جان کر عزت دی یعنی میری اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

نہیں ایسی بات۔۔۔ارے سنو تو سہی۔۔۔اماں دروازے تک دوڑتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے آئیں پر میں جلد از جلد اُس کی ریڑھی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ تیز دھوپ اور گرمی سے بے نیاز میں سرپٹ سائیکل دوڑاتا پسینے سے شرابور جب اُس کی دکان پر پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی وہ پریشان سا ہوگیا۔

ایسی پرانی بائیسکل؟

کل پیدل تھا تو بات شاید اُس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

پر سائیکل اور انسپکٹر؟ کیسا عجیب جوڑ تھا۔

''ارے عرفان صاحب آپ'' اس کے لہجے میں تشکیک کا عنصر آج نمایاں تھا۔

عرفان صاحب کے لئے بوتل۔۔۔۔

میری بات سنو۔۔۔میں نے بوتل والے کھوکھے کی جانب لپکتے ہوئے لڑکے کو روکنا چاہا مگر وہ جا چکا تھا۔

میری بات سنو بھولے میں عفی نہیں نذیر ہوں۔عفی کا کزن۔ میں نے بی۔اے کیا ہے سیکنڈ ڈویژن میں۔ میرا باپ اب تک معمولی درجے کا وکیل ہے۔ بوڑھا ہوگیا ہے پر روز کچہری جاتا ہے۔ کبھی کبھی میرے پیچھے اس سائیکل پر بیٹھ کے۔ اسے جوا کا دُکا کیس ملتا ہے اسی سے ہماری دال روٹی چلتی ہے۔ ایک سالے بڑے افسر نے اُس کی بے عزتی کی۔ اُسے دھکے دے کر گھر سے نکالا۔ اُس کے واچ مین نے تھپڑ مارا تو میں نے اُس کے دانت توڑ دیے۔ چار ماہ جیل رہا فارغ ہوں۔ ہنر جانتا نہیں نوکری ملتی نہیں۔عفی نے بھی مجھے دفتر سے نکال دیا۔اس سے میری اب قطعاً کوئی سلام دُعا نہیں نہ ہی اس کا آئندہ کوئی امکان ہے۔ میں اُس سے کوئی کام نہیں لے سکتا کسی کا تو کیا اپنا بھی نہیں۔اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے؟

بھولا حیرت کا بت بنا اچانک ملنے والی یہ تمام معلومات سن رہا تھا۔منہ سے کچھ نہ کہہ پایا فقط میرا منہ دیکھتا رہا جیسے غور کر رہا ہو کہ مجھے پہچاننے میں کیسے غلطی ہوئی؟

لڑکا بوتل لے کر آ گیا۔

بھولے نے میری جانب ہاتھ بڑھائے لڑکے کے ہاتھ سے بوتل لی اور بنا کچھ بولے غٹا غٹ اُسے پینے لگا۔

اور میں جس تیزی سے اُس کے پاس گیا تھا اُسی تیزی سے سائیکل دوڑاتا گھر واپس جا رہا تھا۔

☆☆☆

انٹرویو: احمد رضوان

اُستاد شبیر خان طبلہ نواز سے ایک مکالمہ

موسیقی کا حسن لَے کاری میں ہے اور لَے طبلہ قائم رکھتا ہے۔ طبلہ کلاسیکل موسیقی کا ایک ایسا ساز ہے جس پر سنگیت محل کی بنیاد استوار ہے۔ میاں قادر بخش پکھاوجی ساز کاری کی دنیا کا ایک عظیم نام تھے۔ کلاسیکل موسیقی کی تاریخ میں ''پنجاب گھرانہ'' انہی کے بزرگوں کی محنت سے اپنے خدوخال کے ساتھ نمایاں ہوا۔ یہ بجا کہ طبلہ کی روایت ہندوستان سے اس علاقہ میں آئی، لیکن اس فن کو جو نکھار پنجاب نے دیا وہ بھی اپنی ایک مثال ہے۔

موسیقی کے بعض مؤرخین کے نزدیک پنجاب کا طبلہ زیادہ معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ میاں قادر بخش پکھاوجی بیسویں صدی کے عظیم طبلہ نواز تھے جو پہلے پکھاوج بجایا کرتے تھے بعد ازاں طبلے کی طرف آئے۔ میاں صاحب نے ہی ساز کاروں کو گائیک کے برابر کا احترام دلوایا، ایسا صرف وہ اپنی فنی معراج کے باعث کر پائے۔ ان کے عہد سے پہلے طبلہ نواز گلوکار کے پیچھے بیٹھا کرتا تھا، انہوں نے طبلہ نوازی کو اس مقام پر پہنچایا کہ وہ بھی گائیک کے برابر بیٹھ کر بجائے۔ میاں قادر بخش نے جہاں طبلہ کو عروج بخشا وہاں دنیائے موسیقی کو چار شاگرد بھی دیے جنہوں نے چار دانگ عالم میں اس فن کو زندہ رکھنا تھا۔

ان چار شاگردوں میں پہلا نام اُستاد معشوقے خاں کا ہے جو میاں صاحب کے سینئر شاگرد تھے، دوسرا نام اُستاد اللہ رکھے خاں جو انڈیا میں رہے اور دنیا بھر میں نامور ہوئے۔ تیسرا نام اُستاد شوکت حسین خاں کا ہے جو لاہور میں رہے اور پاکستان کے تمام بڑے اساتذہ کے ساتھ سنگت کرتے رہے۔ میاں صاحب کے چوتھے شاگرد اُستاد طافو خاں ہیں جو آج بھی فلم انڈسٹری سے وابستہ ہیں۔ میاں قادر بخش کے ان نامور شاگردوں نے طبلہ کے فن کو اس کی عظمت کے ساتھ زندہ رکھا۔

ان چار شاگردوں کی اگلی نسل میں اُستاد اللہ رکھے خاں کے فرزند اُستاد ذاکر حسین خاں اس وقت دنیائے موسیقی کے نامور طبلہ نواز ہیں جن کا نام ''گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' میں بھی شامل ہے۔ اُستاد شوکت حسین خاں کے شاگرد عبدالستار تاری پاکستان کے علاوہ یورپ میں بھی طبلہ کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ان کے علاوہ اُستاد معشوقے خاں کے فرزند اُستاد شبیر خاں ہیں جو طبلہ کا کلاسیکی انگ بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ شبیر خاں ایک اُستاد گھرانے کے فرد ہیں۔ ہم نے ان سے طبلہ کی تاریخ اور فنی حوالوں سے گفتگو کی جو آپ کے لئے پیش ہے۔

س: خان صاحب پہلے اپنے خاندانی پس منظر کے حوالہ سے بتائیں؟

ج: ہمارا خاندان ''بھیڈی پوترہ'' کہلاتا ہے۔ ہمارے خاندان میں 500 سال سے موسیقی کی روایت چلی آرہی ہے۔ میرے دادا اُستاد رمضان خان عرف رمضا خاں میاں قادر بخش پکھاوجی کے والد میاں فقیر بخش کے شاگرد تھے جبکہ میرے والد اُستاد معشوقے خاں میاں قادر بخش پکھاوجی کے شاگرد تھے۔ میاں قادر بخش کا خاندان سات نسلوں سے طبلے کے فن میں رستم مانا جاتا تھا۔ میاں قادر قادر بخش پہلے پکھاوج بجایا کرتے تھے بعد میں طبلے کی طرف آئے۔ ہمارے خاندان میں پکھاوج بھی بجائی جاتی رہی ہے۔ طبلہ اور پکھاوج کے علاوہ ہمارے ہاں دِلرُبا اور سارنگی بھی بجائی جاتی رہی۔ یوں کہہ لیں کہ ہمارے خاندان میں ساز کاری کی روایت چلی آرہی ہے۔

ہمارے گھرانے نے پاکستان بھر میں اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا۔ میرے ماموں رمضان خاں المعروف ڈوڈ خاں طبلہ نواز تھے۔ چچا احمد بخش عرف نتھو خاں بھی طبلہ بجایا کرتے تھے۔

س: حضرت بخاری شاہ کے تکیہ سے آپ کے خاندان کی وابستگی بڑی پرانی ہے ملتان میں موسیقی کے حوالہ سے اس تکیہ کی کیا اہمیت ہے؟

ج: حضرت بخاری شاہؒ لے تکیہ پر ہمارے بزرگ تقریباً پانچ سو سال سے رہ رہے ہیں۔ ملتان میں موسیقی کی تاریخ کے حوالہ سے اس دربار کی بڑی اہمیت ہے۔ برصغیر کے بڑے بڑے گائیک اور ساز کار یہاں آتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ پنجاب میں اس حوالہ سے دو بڑے معروف تکیے ہیں ایک تکیہ بخاری شاہ جو چوک شہیداں ملتان میں ہے جبکہ دوسرا پایا کبوتر شاہ موچی دروازہ لاہور میں ہے۔ یہ دو ایسے تکیے ہیں کہ جو بھی گانے والا یہاں گاتا وہ مستند تصور کیا جاتا تھا، یہاں گانے والوں کو اسناد ملا کرتی تھیں۔ اُستاد بڑے غلام علی خاں 1930ء کے قریب بخاری شاہ کے تکیہ پر تشریف لائے میرے والد اُستاد معشوقے خاں نے ان کے ساتھ سنگت کی۔ ان کے علاوہ استاد عاشق علی خاں، اُستاد توکل خاں، اُستاد برکت علی خاں، امید علی خاں، میاں قادر بخش پکھاوجی، اُستاد اللہ ڈتہ بہاری پوریا، کریم بخش پیرنا، اُستاد شوکت حسین خاں (طبلہ نواز) طافو خاں، اُستاد سلامت علی خاں اور اُستاد امانت علی خاں سمیت بہت سے معروف گانے بجانے والے یہاں آئے اور پرفارم کیا۔

اُستاد عاشق علی خان کے اُستاد اور ماموں بابا امیر خاں اسی تکیہ میں مدفون ہیں۔ اُستاد عاشق علی خاں ملکہ غزل فریدہ خانم اور کافی گائیکی کی ملکہ زاہدہ پروین کے اُستاد تھے وہ اس تکیہ پر کافی عرصہ رہے۔

س: آپ نے طبلہ کی تعلیم کس عمر سے حاصل کرنا شروع کی، اپنے والد کے علاوہ کن اساتذہ سے فیض حاصل کیا؟

ج: مجھے ذاتی طور پر طبلہ سیکھنے کا شوق تھا اور خاندانی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے نامور والد کی لاج بھی رکھنا تھی۔ والد صاحب کی یہ خواہش تھی کہ میں اچھا طبلہ نواز بنوں۔ انہوں نے مجھے سات سال کی عمر سے سکھانا شروع کیا اور ساتھ ہی خلیفہ اختر حسین خاں شاگرد بھی بنوایا۔ ابتدا انہوں نے سکھانے کی خود کی لیکن شاگرد اختر حسین کا بنوایا۔ خلیفہ اختر حسین خاں پشاور میں ہوا کرتے تھے بعد میں لاہور آئے۔ میں ان سے لاہور میں سیکھتا رہا۔ کچھ عرصہ وہ ملتان میں بھی رہے۔ اپنے والد کے علاوہ میں نے انہی سے طبلہ سیکھا۔

س: برصغیر میں طبلہ نوازی کے معروف خاندان کون سے ہیں اور ان خاندانوں سے کیا طبلے کا کوئی خاص انداز بھی وابستہ ہے؟

ج: میاں قادر بخش کا خاندان پنجاب گھرانہ کہلاتا ہے۔ آج پوری دنیا میں انہی کا طبلہ بج رہا ہے۔ اجراڑہ، خاں صاحب ولایت علی خاں کا خاندان ہے۔ دہلی گھرانہ خاں صاحب کالے کندو خاں کا گھرانہ ہے۔ لالہ بھوانی داس کا گھرانہ بھی طبلہ کے حوالہ سے بڑا معروف ہے۔ گھرانوں کے انداز مختلف ہیں۔ طبلہ کے تین حصے ہوتے ہیں تھاپ، کنار، سیاہی۔ اجراڑہ خاندان تھاپ کے بولوں کے حوالہ سے معروف ہے جبکہ کالے کندو خاں دہلی والے کا انداز تھاپ اور سیاہی کا ہے۔ ان کا انداز ہمارے اُستاد گھرانے یعنی میاں قادر بخش کے انداز سے ملتا جلتا ہے۔

س: ملتان میں آپ کے خاندان کے علاوہ کس خاندان میں طبلہ کا فن چلا آ رہا ہے؟

ج: ملتان میں اس فن کے حوالے سے دو گھرانے تھے جو معروف ہوئے۔ ان میں ایک ہمارا گھرانہ ہے اور دوسرا نقارچی خاندان ہے۔ نقارچی خاندان قدیم عہد سے نقارہ کے فن سے منسلک ہے۔ اس خطے میں طبلے کی آمد سے پہلے لے کاری کے لئے نقارہ بجایا جاتا تھا، بعد ازاں اسی خاندان کے لوگ طبلہ کی طرف بھی آئے۔ نقارچی خاندان کے اُستاد خلیفہ رحیم بخش نقارہ کے ساتھ ساتھ طبلہ بھی بجایا کرتے تھے۔ اِسی خاندان کے اُستاد اللہ ڈیوایا خاں نقارچی بھی معروف ہوئے۔ اُستاد کوڑے خاں طبلہ نواز تو اس خاندان کے معروف طبلہ نواز تھے جنہیں سارا زمانہ جانتا ہے۔ آج کل اُستاد بلے خاں اپنی خاندانی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں جو نقارچی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملتان میں طبلہ کے فن کے حوالہ سے یہی دو معروف گھرانے ہیں۔

س: طبلہ کی ایجاد کے حوالہ سے امیر خسرو کا نام تاریخ کا حصہ ہے یہ بتایئے اس دور میں طبلہ میں کس حد تک کام ہوا؟

ج: حضرت امیر خسرو طبلہ کے موجد ہیں۔ طبلے کی ایجاد سے پہلے برصغیر میں لے کاری کے لئے مردنگ استعمال ہوتی تھی۔ مردنگ کو امیر خسرو نے دو حصوں میں تقسیم کیا اور ایک ''نر'' اور ایک ''مادہ'' حصہ بنایا۔ اس حوالہ سے وہ ایرانی ساز طبل سے متاثر ہوئے اور اسی نسبت سے اس کا نام طبلہ تجویز کیا۔ ان کے عہد میں ہی طبلہ ایک معروف ساز کے طور پر استحصال ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے بعد انڈیا میں اُستاد ولایت خاں اجراڑہ والے کی گت مشہور ہوئی۔ طبلہ میں مختلف انداز کی گتیں بجائی جاتی ہے۔ گت طبلہ بجانے کا ایک انداز ہے۔ اُستاد کالے کندو خاں دہلی والے کی گت بھی مشہور ہوئی لیکن ولایت خاں کے گھرانے کی گت زیادہ مشہور ہے۔ طبلہ جس وقت بجانا شروع کیا جاتا ہے اس وقت اس کی شروعات کچھ اور ہوتی ہیں پھر میٹر کے ساتھ ساتھ اس میں رچاؤ آ جاتا ہے۔ لے کا وزن ایک ہی رہے گا لیکن آخری مراحل میں گتیں بجائی جاتی ہیں۔ جیسے تین تال سولہ ماترے کا ایک دائرہ ہے اس دائرے میں آپ جو بول بھی بجائیں گے ان کے حساب سے گت کے بول علیحدہ ہوں گے۔ اس کا چلن قاعدے سے مختلف ہوگا۔

س: گائیکی میں سنگت کے حوالہ سے طبلہ کی کیا اہمیت ہے؟

ج: دیکھئے، گانے کی عدالت (پرکھ) لے ہے اور لے کا تعلق طبلہ سے ہے۔ سنگت کے دوران طبلے والا ہی لے کو برقرار رکھتا ہے۔ گانے والا ایک ''کیو'' دے گا کہ یہ میرا دائرہ ہے، پھر طبلے والا اس دائرے کو برقرار رکھے گا اور اسی دائرے میں قائم رہے گا۔

س: سنگت کے دوران طلبہ نواز جس فنی وسعت کا مظاہرہ کرتا ہے اسے طبلہ کی زبان میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: سنگت میں طبلے والا جانتا ہے کہ میرا دائرہ یہاں تک ہے۔ پہلے وہ دائرہ بنائے گا پھر اسے خوبصورت بنانے کے لئے پھول پتیاں لگائے گا۔ فنی مہارت کے اظہار کے بعد اسے اپنی جگہ پر واپس آنا ہوتا ہے۔ طبلہ کی زبان میں اسے ''ٹھا دُگن'' کہا جاتا ہے۔ گانے والے کو بولوں کے ساتھ ''ٹھا دُگن'' کی جاتی ہے اور اِدھر اُدھر چل پھر کر دکھایا جاتا ہے۔ ''ٹھا'' طبلے کی زبان میں یہ ہے کہ جو ٹھیکہ لگایا گیا ہے جبکہ ''دُگن'' یہ ہے کہ جو طبلہ نواز اپنی پرواز کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ضروری نہیں غزل سولہ ماترے کی ہے تو ٹھیکہ بھی سولہ ماترے کا لگے گا، بعض اوقات غزل کا ''بر'' بارہ ماترے کا ہوتا ہے لیکن ٹھیکہ ''کیروے'' کا لگتا ہے جو آٹھ ماترے کا ٹھیکہ ہے۔ بجانے والا وہی بول بجائے گا جو گلوکار نے گائے ہیں۔ مختلف انداز سے طبلے والا

اپنی فنی مہارت کا اظہار کرے گا اور جو بھی ہنر اور چلن وہ دکھائے گا یہ سب اپنے دائرے کے اندر رہ کر کرے گا۔ اپنے دائرے سے وہ باہر نہیں آ سکتا۔ وہی دائرہ طبلے والے کی بادشاہی یا سلطنت ہوتی ہے۔

س: طبلے کی زبان میں تال کیا ہے اس کے علاوہ یہ بھی بتائیں کہ مشکل تالیں کون سی ہیں؟

ج: تال ایک وزن ہے، جس سے طبلے کی باریکیاں جڑی ہوئی ہیں۔ طبلے میں بے شمار تالیں بجائی جاتی ہیں پھر ہر تال کی آگے ''تالیاں'' ہیں۔ تین تال سب تالوں کی بنیاد ہے۔ سولہ ماترے کو تین تال کہیں گے۔ سولہ ماترے میں اور تالیں بھی شامل ہیں جیسے تلواڑہ، اکوائی وغیرہ پھر آگے ان کی ''تالیاں'' ہیں۔ تین تال کی تین تالیاں ہیں جن میں ایک خالی ہے۔ ہر تال کا وزن علیحدہ ہوتا ہے اور بول بھی علیحدہ ہوتے ہیں جیسے پندرہ ماترے میں ''پانچ تال کی سواری'' بجائی جاتی ہے جو انتہائی مشکل ہے۔ آج کل جو تالیں ''چل رہی ہیں وہ سات یا آٹھ ہیں جیسے جھپ تال، تین تال، ایک تال، پانچ تال، دُرت تال (برابر کی تال) جے تال اور اندر تال۔ اندر تال وہ تال ہے جو بزرگ لوگ بجا گئے ہیں اب یہ تالیں نہیں بجائی جاتیں۔ آج کل صرف جھپ تال، اک تالہ اور تین تال بجائی جاتی ہیں۔ ''پانچ تال کی سواری'' انتہائی مشکل تال ہے اور سب تالوں سے مشکل تال ہے۔ اسے کم ہی لوگ بجا پاتے ہیں۔ آج کے دور میں کوئی ایسا طبلہ نواز نہیں جس نے ''پانچ تال کی سواری'' بجائی ہو۔

س: طبلہ کے معروف ٹھیکے کون سے ہیں اور ان میں مشکل ٹھیکہ کسے کہا جاتا ہے؟

ج: طبلے کے معروف ٹھیکوں میں اکوائی، تلواڑہ اور پانچ تال کی سواری انتہائی مشکل ٹھیکے ہیں۔ تیرہ ماترے، چودہ ماترے، پندرہ ماترے، بیس ماترے اور بائیس ماترے بجانا مشکل ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ جو طاق تال ہیں وہ مشکل ہیں اور جو جفت تال ہیں وہ آسان ہیں۔

س: موسیقی میں وزن کی تقسیم ماترے سے کی جاتی ہے، یہ بتایئے طبلے کی زبان میں ''ماترہ'' کیا ہے؟

ج: ماترہ ایک طرح سے وزن ہے، ٹیمپو (Tampo) ہے جیسے طبلہ پر ایک ضرب لگائی جاتی ہے اس کے بعد دوسری ضرب لگائی جاتی ہے ان دونوں ضربوں کے درمیان کا جو وقفہ ہے وہ ماترہ ہے۔ ایک ماترے کے چار حصے ہوتے ہیں جو ساڑھ، سوائی، پون اور ماترہ ہیں۔ ماترے کی آدھ ساڑھ ہوتی ہے۔ جیسے کوئی پانچ تال کی سواری بجاتا ہے یہ پندرہ ماترے کا تال ہے، پندرہ کی نصف 71/2 ماترے یعنی آدھا ماترہ آنے سے یہ نصف ساڑھ ہو گیا۔ اب اگر 71/2 ماترے کو نصف کریں گے تو پونے چار بنے گا یہ پون ہے۔ پون کا مطلب ہے ماترے سے چوتھائی کم۔ اب اگر اس میں سوائی لگائیں گے تو اسے سوائی کہا جائے گا۔ سوائی کو آپ

یوں سمجھ لیں کہ ''جھپ تال'' دس ماترے کا تال ہے اس کا نصف پانچ، پانچ کی اڑھائی اور اڑھائی ماترے کی سوا، اسے سوائی کہتے ہیں۔ ماترہ یہ ہے جب آپ ایک ماترے سے دوسرے ماترے تک آتے ہیں اس سفر کا نام ماترہ ہے، اس وقفے کو آپ پورے ماترے کا وقفہ کہیں گے۔

س: طبلہ میں ''ترکٹ'' کی اصطلاح کے حوالے سے کچھ بتائیں؟

ج: ترکٹ سولو پرفارمنس کے بول ہیں جو ''تڑ، تڑ، تڑ'' سے شروع ہوتے ہیں اور یہیں پر آ کر ختم ہوتے ہیں۔ ساتھ سنگت میں بھی ''ترکٹ'' بجالی جاتی ہے۔ جیسے ٹھمری گائیکی میں آپ گانے والے کے بول بجائیں گے۔ ساتھ ساتھ ''دُگن'' کرنی ہے طبلے والا چاہے تو ''ترکٹ'' کی ''دُگن'' کر لے۔ ترکٹ کی اصطلاح کو آپ یوں سمجھ لیں جیسے گرہ لگائی جاتی ہے یا بول بڑھائے جاتے ہیں۔ ترکٹ کا وزن کی وضاحت اور بڑھوتری سے تعلق ہے اس میں رُکن بڑھائے جاتے ہیں۔ ''ترکٹ'' طبلہ نواز کے لئے فنی اظہار کا موقع ہوتا ہے۔ یہاں اسے کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ ترکٹ بجانے سے ہی اصل بجانے والے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ فنی طور پر کس قدر آگاہ ہے۔ ترکٹ کے مشکل بول وہ ہیں جو ہتھیلی سے ادا کیے جاتے ہیں، انہیں ''دھر دھر'' کہا جاتا ہے۔ یہ پورے ہاتھ کے بول ہوتے ہیں اور بہت کم لوگ ہی اسے بجا سکتے ہیں۔

س: طبلے کے بنیادی بول کون سے ہیں؟

ج: جیسے سات سروں میں مختلف راگ گائے جاتے ہیں اسی طرح طبلہ کے بھی بنیادی بول ہیں جو طبلہ کی اصل ہیں، یہ بول دھا، دھن، نا، تا، دھے، دھٹ ہیں۔

س: طبلہ کے فن میں ''سم'' کیا ہے؟

ج: ''سم'' ساتھ سنگت کا گُر ہوتا ہے۔ فرض کیجئے سولہ ماترہ کا ''بر'' ہے پہلے ماترے سے لے کر سولویں ماترے تک کے سفر میں جو آخری ماترہ ہے وہ ''سم'' ہے۔ ''سم'' پورا ماترہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی سولہ ماترے بجاتا ہے اور سولہ ماترے میں 151/2 کی تہائی پر آ کر آدھا ماترہ کم ہو گیا اسے ''آسم'' کہیں گے۔ ''سم'' ایک طرح سے واپسی کا وہ پوائنٹ ہے جہاں طبلہ نواز کو واپس آنا ہوتا ہے۔ لے میں سم کا تعین وہی کرے گا جس نے دھن بنائی ہے۔

س: سنگت کے لئے طبلہ اور ڈھولک کی جو بنیادی فنی تفریق ہے، اس حوالے سے کچھ بتائیں؟

ج: طبلہ اور ڈھولک میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ڈھولک نیم کلاسیکل گانے والے کے ساتھ بجائی جاتی ہے جبکہ کلاسیکل میں صرف طبلے والا ہی سنگت کر سکتا ہے۔ ٹھوس کلاسیکل گائیکی میں ڈھولک کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے علاوہ طبلے اور ڈھولک کے بنیادی بولوں میں بھی فرق

ہے جو انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے ہیں۔

س: گلوکار جس وقت اپنی فنی مہارت کا اظہار تان اور پلٹے کی صورت میں کرتا ہے تو اس وقت طبلے والے کی کیا کارکردگی ہوتی ہے؟

ج: سنگت میں جانب دار اور شفاف طبلہ نواز گلوکار کا پورا پورا ساتھ دے گا اور اپنا چال چلن دکھائے گا۔ دراصل طبلے والا گانے والے کے ذہن اور گائیکی کے مطابق چلتا ہے۔ اس نے گانے والے کو پک (Pick) کرنا ہوتا ہے کہ وہ کس سطح سے گا رہا ہے۔ اسی سطح پر جا کر آپ نے بجانا ہے گلوکار جیسی تان پر جائے گا طبلے والا اس کے ساتھ جائے گا، اسی کو سنگت کی نوک جھونک بھی کہا جاتا ہے۔

س: اب تک آپ نے کن بڑے اساتذہ کے ساتھ سنگت کی اور کیا کبھی آپ کو سنگ میں مشکل بھی پیش آئی؟

ج: اب تک میں اُستاد سلامت علی خاں، اقبال بانو، اختر علی خاں، ذاکر علی خاں، ثریا ملتانیکر، حسین بخش ڈھاڈھی، اُستاد منیر توکل خان، پٹھانے خاں، اُستاد شرافت علی خاں اور اُستاد حسین بخش گلو کے ساتھ سنگت کر چکا ہوں۔ سنگت کا جو مزہ اُستاد سلامت علی خاں کے ساتھ وہ کسی اور ساتھ نہیں آیا۔ رہی مشکل کی بات تو مشکل صرف انہیں لوگوں کے ساتھ پیش آتی ہے جو کلاسیکل گاتے ہیں جبکہ کافی، غزل وغیرہ تو آسانی سے بجالی جاتی ہے۔ گانے والے اور طبلے والے کے درمیان جو نوک جھونک ہوتی ہے اسی سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کتنے پانی میں ہیں۔

س: ملتان میں طبلہ نوازی کے حوالہ سے اُستاد معشوقے خاں اور اُستاد کوڑے خاں نے بہت نام کمایا جبکہ ان کے بعد کے لوگ وہ نام نہیں کما سکے، آپ کے نزدیک ہمارے ہاں کلاسیکل موسیقی کی روایت کمزور ہوئی ہے یا فنکار کمزور ہوا کہ اسے وہ شہرت نہیں ملی جو بزرگوں کو حاصل تھی؟

ج: موسیقی کی روایت تو چلی آ رہی ہے جس شکل میں بھی ہے۔ دراصل فن کا حصول انتہائی مشکل ہے، یہ محنت کا کام ہے اور محنت کے بعد فن کار کو وہ حق نہیں ملتا جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ کلاسیکل فنون کی روایت کمزور ہوئی ہے اور بہت سے لوگوں نے فن کی دنیا ہی چھوڑ دی ہے۔ میرے خیال میں فن کار آج بھی باصلاحیت ہے، وہ آج بھی محنت کر رہا ہے لیکن لوگوں کی توجہ واقعی کم ہوگئی ہے۔ ہمارے اپنے خطے میں کلاسیکل گائیک کو سننے والا اب کوئی نہیں، پہلے ٹھمری، غزل غرض ہر صنف کے چاہنے والے موجود تھے۔

س: کلاسیکل فنون کے زوال میں روایتی اساتذہ کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ انہوں نے فن اپنے خاندان تک محدود رکھا، اس ضمن میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: اس حوالے سے پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ آج کے عہد میں وہ لوگ نہیں جو موسیقی کا جنون رکھتے تھے۔ طبلے کا کلاسیکل انگ سیکھنے والا میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ جیسے ہی کوئی شاگرد غزل، گیت بجانے لگتا ہے، اس کا ہاتھ چلنا شروع ہوتا ہے تو وہ تعلیم بھی چھوڑ دیتا ہے اور ریاض بھی۔ ہمارے بزرگوں نے ملتان سے لاہور جا کر سیکھا اور اساتذہ کی خدمت کی۔ میرے والد اُستاد معشوقے خاں نے زندگی کا بڑا حصہ اُستاد کی خدمت میں لاہور گزارا، جس کا انہیں فیض بھی ملا۔ فن کے لئے جس کشٹ کاٹنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہیں ہے لوگوں میں۔ پہلے واقعی لوگوں کو شوق تھا۔ فن کی دنیا میں اُستاد کا رتبہ بہت بلند ہے۔ باقی رہا کہ فن خاندانوں تک محدود ہو گیا ہے تو اس حوالہ سے یہ کہوں گا کہ میرے والد نے عطائی لوگوں کو بھی طبلہ سکھایا۔ اس کی مثال عمر حیات طبلہ نواز ہیں۔ عمر حیات بابا جی (اُستاد معشوقے خاں) کے عطائی شاگرد تھے۔ بابا جی نے انہیں اتنا سکھایا کہ مجھے بھی نہیں سکھایا، یہاں تک کہ مجھ سے چھپ کر بابا جی انہیں سکھایا کرتے تھے۔ اب اس حوالے سے میں اور کیا عرض کروں۔

س: طبلہ بجانے کے لئے انگلیوں کی پوروں اور ہاتھوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، کیا اس کے لئے خاص قسم کی انگلیوں کی ضرورت ہوتی ہے یا آدمی کا جنون اس کے ہاتھوں کو مطلوبہ سانچے میں ڈھال دیتا ہے؟

ج: طبلے کے لئے مخصوص ہاتھوں کی ضرورت تو ہوتی ہے لیکن اس کا زیادہ تعلق شوق اور جنون کے ساتھ ہے۔ طبلہ کے لئے نفیس ہاتھ اچھے رہتے ہیں، اس کے علاوہ لمبے اور لچکدار ہاتھ بھی موزوں رہتے ہیں۔ کھردرے ہاتھ طبلہ کے لئے ٹھیک نہیں رہتے جبکہ چھوٹے ہاتھوں سے محنت زیدہ کرنا پڑتی ہے۔

س: زندگی کی یادگار ''سولو پرفارمنس'' آپ نے کہاں دی؟

ج: میری زندگی کا یادگار پروگرام بابا جی کی زندگی میں ہی ہوا۔ لاہور سے اُستاد لگے خاں آئے ہوئے تھے جو بڑے اعلیٰ پائے کے طبلہ نواز تھے، انہوں نے فلم انڈسٹری میں بھی کام کیا۔ ان کی موجودگی میں، میں نے ''سولو پرفارمنس'' دی۔ اس پروگرام میں میرے علاوہ اُستاد لگے خاں اور بلے خاں نے بھی بجایا۔ اس کے علاوہ بہاول پور میں اُستاد توکل خاں کی برسی پر بھی میں نے سولو پرفارمنس دی تھی جو بڑی یادگار رہی۔

☆☆☆

اوریانہ فلاشی / خالد سعید **قسط ۱۰**

ایک مرد

یہ ایک قاعدہ ہے کہ مفرور کو جیل سے باہر کسی شخص کے ساتھ ساز باز کرنے پر انحصار کرنا ہوتا ہے، ایک ایسا شخص جو عین وقت پر ایک کار لیے اُس کا منتظر ہو اور جو اُسے اپنی جدوجہد اور جنگ کو جاری رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن ایک غیر ممکن جوئے کے لیے تمہارے ذوق وشوق، اور بداعتمادی نے مسئلے کے اس حل کو سختی سے مسترد کر دیا۔ تم نے موراکس (Morakis) کو بیرونی مدد لینے سے منع کر دیا۔ دراصل تمہارے گمان میں کسی بھی شخص کو یہ علم نہیں ہونا چاہیے کہ تم جیل سے بھاگ رہے ہو، اور یوں ہر شے کو اتفاقِ محض اور تمہاری صوابدید پر چھوڑ دیا گیا، چنانچہ جب تم مرکزی شاہراہ تک پہنچے تو وہاں تمہاری کسی قسم کی امداد کے لیے کوئی ذی نفس موجود نہ تھا ''اب ہم کیا کریں گے؟'' موراکس (Morakis) نے ایک پریشانی کے عالم میں پوچھا: ''اب یہ بذریعہ بس ایتھنز جائیں گے۔'' ''ہم بس پر سفر کریں گے؟'' اتنے میں ایک مسافر بس آئی اور تم دونوں اُن پر سوار ہو گئے۔ لیکن بہت جلد تمہیں اس امر کا احساس ہو گیا کہ تم سے ایک سنگین غلطی کا ارتکاب ہو چکا تھا۔ کیچڑ میں لت پت اور پھٹی ہوئی وردی کے ساتھ تم دونوں کسی صورت کارپورل نہ دکھائی پڑتے تھے۔ بس کنڈیکٹر تمہیں ایک عالم حیرت میں گھورا کیا: ''تم دونوں کہاں سے لڑ جھگڑ کے آئے ہو؟'' ''بالکل، آپ کا خیال درست ہے، ایک جوؤں بھرے سور کے بچے اور بے غیرت نے فوج کی توہین کی۔'' ''کیا تم شہر جاؤ گے؟'' ''نہیں، ہم اگلے سٹاپ پر اُتر جائیں گے؟ تم اگلے سٹاپ پر بس سے اُتر گئے۔ موراکس (Morakis) اَب بے حد مضطرب تھا ''آلیکاس سوچو اَب کیا ہو گا؟'' ٹیکسی لیتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک ٹیکسی کار قریب آ کر رُکی۔ اس ٹیکسی کے ذریعے تم نے بمشکل چند میل کا سفر طے کیا، کیونکہ اس گاڑی کے پاس بائیو آئی کی حدود سے باہر جانے کا اجازت نامہ موجود نہ تھا۔ اس کے بعد تم دونوں پھر پیدل ہو گئے۔ صرف رات کی اَتھاہ تاریکی تمہاری حفاظت کی ضامن تھی۔ ''اور اَب آگے کیا کرنا ہے؟'' ''سب سے پہلے تو میں اِس نجس وردی سے نجات حاصل کرتا ہوں۔'' تم ایک گھنے درخت کے پیچھے چلے گئے، اور موراکس (Morakis) کے بیگ میں چھپایا ہوا لباس نکالا۔ اور اسے تبدیل کر کے اطمینان کا سانس لیا: بے شک اَب انہیں فوجی وردی میں ملبوس دو کارپورلوں کا نشان نہ مل سکتا تھا۔ ''اور اب اگلا سفر؟'' ''کوئی دوسری ٹیکسی دیکھتے ہیں اور پھر تیسری ٹیکسی کار کے ذریعہ ایتھنز تک پہنچ جائیں گے۔ تیسری ٹیکسی کار کے ذریعے تمہیں اپنے منصوبہ کی پریشان کن کمزوری کا احساس ہوا۔ اس منصوبہ کا تمام تر انحصار خوش بختی پر تھا: مسئلہ اَب یہ درپیش تھا کہ تمہیں پناہ کون دے گا؟ جیل سے فرار کی تیاریوں کے دوران موراکس (Morakis) نے تم سے اِس بارے میں بارہا استفسار کیا: ''اگر ہم جیل سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تو ہماری اگلی منزل کیا ہو گی؟ میں تو اپنی ایک دوست لڑکی کے عزیز کے ہاں چھپ جاؤں گا۔ مگر تم؟ پولیس تمہارے خاندان کی کڑی نگرانی کر رہی ہے۔ تمہارے تمام دوست اور ساتھی

جیل میں ہیں۔ تمہیں کہاں پناہ ملے گی؟'' اور تمہارا پُر اعتماد جواب سدا یہی ہوتا: ''اس بارے میں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں، مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے ہزاروں لوگ تیار ہوں گے۔'' لیکن وہ لوگ کون تھے؟ یہ وہ لوگ تھے جو اُس وقت قدم آگے بڑھاتے ہیں جب خطرہ ماضی کا حصہ بن چکا ہوتا ہے۔ گفتار کے دھنی اُس وقت تک ''بڑھکیں'' لگاتے ہیں اور ''بہادری'' دکھاتے ہیں۔ جب ملک میں جمہوریت بحال ہو جائے۔ اِن بزدلوں پر اگر کبھی آزمائش کا وقت آن پڑے تو یہ بھڑکتی آگ میں موم کی طرح تحلیل ہو جاتے ہیں؟ اُن میں سے کچھ نے تو دروازہ کھولنے کی زحمت بھی نہ کی اور تمہیں دور ہی سے جواب دے دیا۔ ''کون ہے؟'' ''یہ میں ہوں، آلیکاس پاناگاولس، سُن رہے ہو، مَیں جیل سے بھاگ آیا ہوں، مجھے اندر آنے دو۔'' ''معاف کرو بابا، ہمارے ساتھ مسخریاں کر رہے ہو، دور دفعان!'' بعض نے تھوڑا سا در کھولا، لیکن جب تمہارے ہاتھوں میں زنجیر دیکھی اور تم پر نگاہ پڑی تو وہ حواس باختہ ہو گئے: ''آلیکاس، مجھ سے یہ نہیں ہو گا، تمہیں پناہ دینا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ، میں یہ نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ وہ لڑکی بھی جو تم سے محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتی تھی، تمہیں یوں دھتکارا جیسے تم کوئی منگتے ہو یا پھر کوڑھ کے مریض: ''دفع دور، فوراً بھاگو یہاں سے، میں تمہاری وجہ سے ای۔ ایس۔ اے کے ہتھے کیوں چڑھوں؟'' صبح کے تین بجے تک تم ایک گھر اور علاقے سے دوسرے گھر اور علاقے تک بھٹک رہے تھے۔ موراکس (Morakis) کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ ''آلیکاس اب ہم کیا کریں؟ میں تمہیں کس کے سپرد کروں؟'' کسی محفوظ مقام کی اس پیدل تلاش نے تمہیں تکان سے نڈھال کر دیا تھا اور تم سارے راستے خود کو گھسیٹتے ہوئے یہ بڑبڑاتے رہے: ''شاید اَب میں اِن کٹھنائیوں کا عادی نہیں رہا، مجھے آرام کرنا ہے، مجھے سستانا ہے۔'' آخر کار تمہاری نگاہ ایک تازہ گری ہوئی عمارت کے ملبہ پر پڑی! ''اس جگہ ہم کچھ دیر کے لیے سستا نہ لیں؟'' موراکس (Morakis) کا فوری جواب آیا، ''بالکل ٹھیک!'' تم دونوں بچوں کی طرح ایک دوسرے کی ٹانگوں میں ٹانگیں ڈالے فوراً ہی گہری نیند میں چلے گئے۔ صبح کے وقت تمہاری آنکھ ایک چنگھاڑ سے کھلی: ''ہم جنس پرستو، گناہوں کی پوٹلیو، ہمارے کام کی جگہ پر یہ گندے کار: ابھی تمہارے دماغ ٹھکانے لگاتے ہیں: سمجھے؟ پولیس، پولیس!'' تمہارے پاس بمشکل اتنا وقت تھا کہ وہاں سے اُٹھ کر دوڑ لگا دو۔ ناراض اور مشتعل کارکنوں کے ایک گروہ نے تمہارا تعاقب کیا۔ تیزی سے ایک موڑ مڑنے کے بعد تم چند لحظوں کے لیے رُکے: ''دوست، جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے، جلدی کرو!'' لیکن آلیکاس میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا، میں یہ نہیں کر سکتا!'' ''یہ ہو گا، بالکل تم یہ کر سکتے ہو، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے بھاگ جاؤ!'' ''لیکن آلیکاس مجھے بتاؤ کہ تم کہاں جاؤ گے؟' کہاں؟'' ''اس وقت میں تمہیں ٹھیک سے شاید بتا نہیں سکتا، لیکن تمہیں اس کے بارے میں تردد کرنے کی ضرورت نہیں، بھاگو، فوراً بھاگ جاؤ!'' کارکنوں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ تمہاری جانب بڑھ رہے تھے: ''پولیس، ان مجرموں کو گرفتار کرو، پولیس!'' تمہارے پاس اتنا وقت بھی نہ تھا کہ اس کا شکریہ ہی ادا کر سکتے یا اُسے یہ کہہ سکتے کہ دوست ہم کبھی کسی اور موڑ پر ضرور ملیں گے۔

تم اب اس شہر میں کلیتاً تنہا تھے جو آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ اَب تم سورج کی روشنی کی زد میں تھے اور تمہارا چہرہ، جس کی تصویریں صرف چھ ماہ قبل تمام اخبارات کو مہیا کی گئی تھیں، گو یونان ایک ایسا دیس ہے جہاں کا ہر مرد مونچھ ضرور رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود تم اپنے مخصوص مونچھوں کی وجہ سے قابلِ شناخت تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم نے کم از کم اپنی مونچھیں منڈا لی ہوتیں اور پولیس کا اشتہار اس طرح ہو گا: ''اُس نے نیلی قمیض کے ساتھ سیاہ پتلون پہن رکھی ہے اور اُس کی سیاہ گھنی مونچھیں ہیں!'' اور اس وقت جبکہ صبح کے سات بج رہے تھے۔ تمہیں اس امر میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ پولیس کو جیل سے تمہارے فرار کی اطلاع ہو چکی تھی اور وہ جگہ جگہ تمہارے تلاش میں چھاپے مار رہی ہو گی۔ لہٰذا ٹیکسی کرایہ پر لینے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ گلیاں خواہ سونی ہوں یا بھیڑ بھری، ہر دو صورت انہیں پیدا چلنا بھی حد درجہ خطرناک تھا۔ لیکن وقت بہت کم تھا اور یہیں اسی ہمسائیگی اور علاقہ میں اس مسئلہ کا فوری حل درکار تھا۔ لیکن یہ علاقہ تھا کون سا؟ اوہ، ہاں یاد آیا: کپسلی (Kipseli) مگر اس علاقے میں کون رہتا ہے؟ ''پیٹسا س(Patitsas)! ڈیمیڑوس پیٹسا س(Demetrios Patitsas)! گذشتہ رات تمہیں اس کا دھیان کیوں نہیں آیا؟ وہ تمہارا دور پار کا رشتہ دار تھا اور تحریک مزاحمت سے وابستہ تھا: دوران تفتیش، تھیوفلیوانکوس (Theophiloiannakos) نے تمہیں تشدد کا نشانہ بناتے ہوئے اُس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ ''یہ ڈیمیڑوس(Demetrios) کون ہے جس نے تمہیں جعلی پاسپورٹ مہیا کیے تھے؟ بولو تم اسے کب سے جانتے ہو؟'' ایک بار پھر تم نے اُسے اپنی ''خاموشی'' سے مات دی۔ وہ تم سے کچھ بھی نہ اگلوا سکا: شاید وہ اسی احسان کے بدلے تمہیں ایک رات کے لیے اپنے ہاں پناہ دے دے۔ لیکن اُس کے گھر کا ٹھیک پتہ کیا تھا؟ تم نے اپنے ذہن پر زور ڈالا، ہاں: پیٹموس(Patmos) گلی اور مکان نمبر___ مکان___ مکان نمبر اکاون، لیکن پیٹموس(Patmos) گلی کو یہاں سے کون سے راستہ جاتا ہے؟ یہاں سے تمہیں پہلے دائیں مڑنا ہو گا، پھر بائیں اور ایک بار پھر دائیں___ پیٹموس گلی! یہ تو ہجر کی رات ہی ہو گئی ہے، جس کا کوئی انت نہیں ہوتا: تم نے غور سے دیکھا، یہ مکان نمبر ایک سو انچاس ہے، مکان تم اور آگے چلے، مکان نمبر ننانوے آ گیا، مکان نمبر ستانوے، اور یہ مکان نمبر پچانوے ہے___ تم اس خوف سے اپنے سر کو جھکائے ہوئے چل رہے تھے کہ کہیں کوئی تمہیں مڑ کر یہ نہ کہے: ''ارے یہ کہیں آلیکاس پانا گاولس تو نہیں جا رہا؟ تم نے پھر دیکھا مکان نمبر ستاون، مکان نمبر ترپن اور بالآخر تم پنی منزل مقصود مکان نمبر اکاون تک پہنچ گئے اور تم نے اطلاع کے لیے گھنٹی بجائی۔ بائیں جانب اوپر سے بذریعہ انٹرکام ایک نیند آلود آواز آئی: ''کون ہے؟'' ''میں ہوں'' ''ارے بھئی میں کون؟'' ''ڈیمیڑوس(Demetrios) خدارا کوئی وقت ضائع کیے بغیر دروازہ کھولو!'' ایک چرچراہٹ کے ساتھ سامنے کا دروازہ کھلا۔ اس جگہ کوئی چوکیدار یا دربان موجود نہ تھا۔ کچھ دیر کے لیے تم ہچکچائے۔ ایلی ویٹر یا سیڑھیاں؟ اور پھر اُن سیڑھیوں کے ذریعے تم ہانپتے اور کانپتے ہوئے اوپر چڑھے، ایک ایسا شخص جس نے گیارہ ماہ تک ایسا کوئی کار نہ کیا ہو اور جس کی ٹانگیں کام کرنا ہی بھول گئی ہوں۔ پانچویں منزل تک پہنچنا

جوئے شیر لانا تھا۔ وہاں چھوٹے سے چہرے والا خوفزدہ شخص تمہیں گھور رہا تھا۔ وہ جانے کس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اب تمہیں واپس بھجوانے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ لیکن تم نے اپنی وکالت کے سلسلے میں کوئی وقت نہ ضائع کیا۔ ایک جست لگا کر تم اُس کے کمرے میں داخل ہوئے او دروازہ بند کر دیا۔ ''سنو ڈیمیڑوس(Demetrios)، میں جیل سے بھاگ کر آیا ہوں۔ تمہیں مجھے بس ایک رات کے لیے پناہ دینا ہو گی۔'' ''جیل سے بھاگنا، کیا مطلب؟! مجھے بتاؤ تو سہی۔'' ''چھوڑو، بعد میں سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال مجھے ایک استرا چاہیے تا کہ میں اپنی مونچھوں سے نجات حاصل کر لوں۔

مونچھوں کے بغیر تم قریب قریب ناقابلِ شناخت تھے۔ تم نے ایک بیزاری کے عالم میں آئینہ میں اپنا عکس دیکھا کہ جو کوئی ایسا درخشاں بھی نہ رہا تھا اور پھر اس گھر کا بغور جائزہ لیا۔ ایک ہی نگاہ میں تمہیں اس امر کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک محفوظ پناہ گاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ پیٹموس(Patmos) گلی ایک طرح کے قصبہ میں واقع تھی اور پیٹسا س(Patitsas) کا فلیٹ جس عمارت میں واقع تھا۔ وہاں اس سے مماثل کئی عمارات موجود تھیں۔ اس گھر کی ٹیرس دوہری تھی، جہاں سے بوقت ضرورت تم بآسانی چھلانگ لگا کر ملحق چھت پر اُتر کر فرار ہو سکتے تھے۔ لیکن تمہارے اُس وقت کے وچاروں میں ایسی ضرورت نہ پڑ سکتی تھی: کون یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو؟ سیڑھیوں پر یا نیچے تمہیں کسی نے بھی تمہیں یہاں آتے ہوئے نہ دیکھا تھا اور سامنے کی کھڑکیوں سے بھی کس طرح کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا، کیونکہ یہ کھڑکیاں بہت نیچے واقع تھیں۔ تم نے اس فلیٹ کے کمروں کو شمار کیا: رہائش کا کمرہ، غسل خانہ، باورچی خانہ اور ایک ایسا کمرہ کہ جس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ''یہاں کون ہے؟'' ''ایک دوست'' ''میرا خیال تھا کہ تم یہاں اکیلے رہتے ہو!'' ''نہیں، لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک سچا اور کھرا دوست ہے، ایک کامریڈ'' ''کیا نام ہے۔ اس کا نام اور وہ کرتا کیا ہے؟'' ''پرڈیکارس(Perdecaris) یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔'' ''میں اُس سے گفتگو کرنا چاہوں گا؟ پیٹسا س(Patitsas) نے اُس کمرے کا دروازہ کھولا، کینیڈی برادران کی تصویروں، ریڈسکوائر میں پیازوں کی چوٹی کے پوسٹر اور کریملن کی تصویر تلے ایک نوجوان محوِ خواب تھا۔ تم اپنے چہرے پر حد درجہ سنجیدگی طاری کر کے کمرے میں داخل ہوئے اور اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور پھر بھرپور اعتماد کے ساتھ اُسے کہا: ''سنو نوجوان، میرا نام پانا گاولس(Pana Goulis) ہے اور میں بوآئیاٹی جیل سے بھاگ کر آیا ہوں۔ فوج اور پولیس میرے تعاقب میں ہے اگر کوئی احمقانہ حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس کا مطلب سمجھتے ہو؟'' پہلے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا لیکن جب اُس کے اوسان بحال ہوئے تو وہ اپنے بستر سے اُچھل کر اُٹھا اور تمہاری تنبیہ کا جواب، وفاداری کی قسموں اور منہ پر بوسے ثبت کرنے سے دیا۔ پھر وہ تم سے پرجوش انداز میں بغل گیر ہو گیا۔ ''آلیکاس، تمہیں شاید اس امر کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں، آلیکاس، میرے جانباز، میں تمہاری خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دوں گا۔'' اور پیٹسا س(Patitsas) نے دیوار پر لگی کینیڈی برادران اور کریملن کی تصویروں کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے کہا، ''کیوں میں نا کہتا تھا کہ تمہیں خوامخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں! یہاں تم اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے درمیان ہو، اور قسم خداوند کی کہ تمہیں اس سے بہتر اور محفوظ پناہ گاہ نہ مل سکتی تھی، مگر تو سیدھے میرے پاس کیوں نہیں آئے؟ خیر اب کچھ کھاؤ پیو اور آرام کرو اور شیاطین کے سردار، ذرا ہمیں یہ تو بتاؤ کہ بائیو آٹی ایسی خوفناک جیل سے تم بھاگنے میں کیسے کامیاب ہوئے۔ آفریں، صد آفریں! وہ اسی طرح کی یقین دہانیوں اور تمہیں مکھن لگانے میں اُس وقت تک لگا رہا، حتیٰ کہ ریڈیو سے اُس خبر کا اعلان نشر ہوا۔ محافظوں کو جیل سے تمہارے فرار کا پتہ صبح آٹھ بجے اُس وقت چلا، جب انہیں موراکس (Morakis) کی تحویل میں تمہارے سیل کی کنجیاں نہ ملیں اور جب محافظوں نے سیل کا دروازہ توڑا، تو انہیں پتہ چلا کہ موراکس (Morakis) دونوں جیل سے غائب ہو چکے تھے اور اب موراکس کو بھی ایک ''غدارِ وطن'' اور شریک جرم کے طور پر تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس خبر سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ تمہیں ہر صورت اپنے وطن سے ہجرت کرنا پڑے گی، مگر کیسے؟ سمندری سفر زیادہ محفوظ ہوگا یا زمینی؟ پیٹٹ ساس (Patitsas) کی سوچی سمجھی رائے میں کسی چھوٹے سمندری جہازی یا دخانی کشتی کے ذریعے فرار زیادہ بہتر ہوگا۔ پرڈیکارس (Perdicaris) نے خیال ظاہر کیا کہ تم البانیہ اور یوگوسلاویہ کی سرحدوں سے گزر کر بآسانی یورپ میں پہنچ سکتے ہو اور خود تمہارے وچاروں میں اگر تمہیں کسی صورت پاسپورٹ مہیا کر دیا جائے، تو مونچھوں کے بغیر اور آنکھوں پر تاریک چشمہ لگا کر تم ناقابل شناخت ہو جاؤ گے اور اس حلیے میں تمہارے لیے ہوائی سفر کہیں بہتر ہوگا لیکن جعلی پاسپورٹ کا بندوبست کون کرے گا۔'' ''کیوں ڈیمٹروس (Demetrios) اس کا انتظام کر سکتے ہو؟'' ''بالکل، کل تک تمہارا پاسپورٹ بن جائے گا۔'' لیکن دوسرے دن اس معاملہ کو ملتوی کر دی گیا۔ ''تم تو جانتے ہی ہو کہ آج اتوار ہے۔ اتوار کو چھٹی ہوتی ہے اور ہر شخص ساحل سمندر پر جاتا ہے۔ پھر ہم نے دو لڑکیوں سے ملاقات کا وعدہ بھی کر رکھا ہے اور اگر ہم معینہ وقت پر وہاں نہ پہنچے تو اس سے خوامخواہ شکوک وشبہات پیدا ہوں گے۔ لہٰذا آلیکاس ڈیئر اب ہم چلتے ہیں، خدا حافظ، ہاں ہماری ملاقات اب رات کے کھانے پر ہوگی۔''

ڈنر کے وقت وہ نہ پہنچے اور تم اُن کے انتظار میں بیٹھ گئے، آدھی رات بیت گئی، رات گہری تر ہوتی چلی گئی، سوموار کی صبح، دوپہر اور سہ پہر بھی گزر گئی مگر اُن دونوں کا دُور دُور تک کوئی نشان پتہ نہ تھا۔ کیا ہوا، کہاں گئے، کیوں نہیں آئے؟ تشویش کے پسینہ میں بھیگتے ہوئے تم پہروں کی پیائش کرتے رہے اور وقت کا ہر پل تمہارے آگے کوئی ایک بھیانک مفروضہ لیے کھڑا تھا۔ ممکن ہے انہیں گرفتار کر لیا گیا ہو۔ مگر نہیں یہ ممکن نہیں تھا۔ ایسی صورت میں پولیس اب تک تمہاری تلاش میں آ چکی ہوتی۔ شاید اُن کی گاڑی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ نہیں، اس کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر ہے کہ ایسے وقوعہ کی صورت میں کوئی نہ کوئی تم سے ضرور رابطہ کرتا اور اگر انہوں نے خود وہاں جا کر ___ تو پھر کیا ہوگا ___ اوہ نہیں تم اس ناپسندیدہ امکان کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تو پھر ظاہر ہے کہ وہ اُن لڑکیوں کے پاس ٹھہر گئے ہوں گے اور وہیں اُن کے ساتھ ہی سو گئے ہوں گے۔ لعنت ہو اِن

مردودوں پر! کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ تم کس قدر اکیلے، پریشان اور اعصابی تکان کا شکار ہو، اور پھر تمہیں کوئی وقت ضائع کیے بغیر ملک سے ہجرت بھی کرنی ہے؟ اور پھر یہاں تمہارے پاس کھانے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ انہوں نے ریفریجریٹر میں صرف دو انڈے، ایک ٹماٹر اور ہفتہ کی رات کو باقی بچ جانے والا پنیر چھوڑا تھا۔ انڈے اور پنیر تو تم نے اُسی وقت نوش جان کر لیا تھا اور بعد میں ٹماٹر بھی کھا لیا اور اب یہاں ماسواڈبل روٹی کے ایک سوکھے ٹکڑے کے اور کچھ بھی نہ بچا تھا۔ کیا انہوں نے اس بارے میں کچھ نہ سوچا؟ جب تک کہ ___ نہیں، نہیں، ناممکن، ڈیمٹروس (Demetrios) ایک ایسا شخص تھا کہ جس پر تم بھروسہ کر سکتے تھے اور بلاشبہ پرڈیکارس (Perdicaris) ایک نیک سیرت لڑکا تھا۔ دراصل وہ تمہارے لیے جعلی پاسپورٹ تیار کرا رہے ہوں گے اور اسی کارن انہوں نے اب تک تم سے رابطہ نہ کیا تھا۔ تم نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی، مگر اس کے باوجود شک کا سانپ تمہارے اندر زہر گھولتا رہا اور اُس کی کنڈل دار سخت گرفت میں تمہاری بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ تم نے بے بسی کے عالم میں خود کو بستر پر لا پٹکا، مگر پھر وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے، پہلے ریڈیو لگایا، لیکن پھر تذبذب، طیش اور بیچارگی کی ملی جُلی کیفیت میں اُسے بند کر دیا۔ یہاں سے روانہ ہو جاؤں یا ابھی رکوں؟ اس گھر سے چلے جانا پاگل پنا ہوگا، لیکن یہاں رُکنا بھی ایک سنگین غلطی ہوگا؟ فرض کرو کہ تمہیں خوش آمدید کہنے کے باوجود انہیں خوف نے آلیا ہو اور عموماً بدترین حادثات و واقعات کا سبب خوف ہی ہوتا ہے۔ تم اپنی چشم تصور میں انہیں اپنے چھوٹے چھوٹے کٹیا نما چہروں، چکنے بالوں اور بے ہودہ بلیو جینز سمیت یہ کہتے ہوئے دیکھ اور سُن سکتے تھے: ''کیا یہ سب کچھ ہمارے ساتھ ہی ہونا تھا۔ یہ آفت ہم پر کیوں ٹوٹی، نہیں، میں اُس کی خاطر جیل کی ہوا کیوں کھاؤں؟'' ''میں نے بھی کیا جرم کیا ہے؟'' ''فرض کرو ہم سیدھا پولیس اسٹیشن چلے جائیں اور اُس کے بارے میں بتا دیں'' ''نہیں سب سے زیادہ سادہ طریقہ یہ ہے کہ ہم گھر ہی نہ جائیں، خود ہی جب وہ بھوک کے ہاتھوں خجل ہوگا تو جلد یا بدیر یہاں سے بھاگ نکلے گا۔'' اور اب تمہیں اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ پیٹموس (Patmus) گلی میں پناہ کے لیے آنا ایک سنگین غلطی تھی اور قیمتی وقت کا ضیاع۔ خیر جب تاریکی چھا جائے گی، تو تم یہاں سے بھاگ نکلو گے۔ تم نے وہاں رات پڑنے کا انتظار کیا، اور جب تم وہاں سے نکلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو یکا یک ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ ''آلیکاس ہم آ گئے، معاف کرنا، یہ عورت ذات، دیری کا سبب وہ ''گشتیاں'' تھیں!'' مردوں کی اس دنیا میں کہیں جو کچھ بھی واقع ہو، قصور ہمیشہ عورتوں کا ہی ہوتا ہے۔ ''آلیکاس، انہوں نے ہمیں یرغمال ہی بنا لیا، ہم مسلسل اُن سے یہ منت کرتے رہے کہ ہمیں اُسے صرف ٹیلی فون کرنے کی ہی اجازت دے دو، مگر انہوں نے ہمیں ملنے تک کی اجازت نہ دی اور اس سارے وقت میں ہم بس تمہارے بارے میں ہی سوچتے رہے۔ ہم تمہارے لیے بندرگاہ پر بھی گئے تھے اور جہاز کے بارے میں پوری اطلاعات لے کر آئے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا بحری جہاز ہے جو بدھ کے روز پائرلیس (Piraeus) کی بندرگاہ سے اٹلی کے لیے روانہ ہوگا۔''

اُن برسوں میں جب ہم ایک ساتھ رہے اور مجھے تمہیں جاننے کا موقع ملا، تب مجھے پتہ چلا کہ

تم اس موضوع پر بہت کم اظہار خیال کرتے تھے، اور کبھی یہ موضوع زیر بحث آ بھی جاتا تو تم بات کرتے ہوئے حد درجہ ہچکچاتے تھے۔ جب میں اُن دنوں کے بارے میں کریدنے کی کوشش کرتی کہ جو تم نے پیٹٹ ساس (Patitsas) اور پرڈیکارس (Perdicaris) کے ساتھ اُس گھر میں گزارے تھے تو تم پیلے پڑ جاتے اور مجھ سے کہتے ''چھوڑو کوئی اور بات کرو۔'' خیر ایک بار بہر حال اس ضمن میں تمہاری خاموشی ٹوٹ گئی اور تم نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جو میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ تم نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اُن دونوں کی آوازوں کو سنتے ہی ___ ''آلیکاس ہم آ گئے ہیں اور عورتیں تو ہوتی ہی گشتیاں ہیں'' تمہیں اپنے معدے میں چبھن اور سکڑاہٹ کا احساس ہوا اور اُن کے چہروں پر نظر ڈالتے ہی تمہیں ایک گہرے اضطراب نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُن کی گفتگو میں کوئی ایسی شے تھی کہ تم اُن کی کسی دلیل کے قائل نہ ہوئے۔ وہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہے تھے، حد درجہ مخلصی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ باتیں بنا رہے تھے اور اُن کی باتوں میں واضح تضاد موجود تھا۔ کیا وہ واقعی اُن لڑکیوں کے ساتھ مصروف تھے یا تمہارے لیے پاسپورٹ بنوا رہے تھے؟ یہ دونوں باتیں آپس میں لگا نہ کھاتی تھیں اور وہ چھوٹا بحری جہاز، وہ کس قسم کا بحری جہاز تھا؟ اُس تک اُن کی رسائی کیسے ہوئی، اس سلسلے میں اُن لوگوں سے تفصیلات طے کرتے ہوئے انہوں نے کیا کہانی گھڑی؟ اور یہ سوچ کر تمہارا لہجہ درشت ہو گیا۔ ''باتیں کم بتاؤ اور مجھے صحیح تفصیلات سے آگاہ کرو۔'' ''آلیکاس، خوامخواہ پریشان کیوں ہو رہے ہو، ہم تمہیں سب کچھ بتا دیں گے، حوصلہ میرے دوست حوصلہ، ذرا شانت تو ہو جاؤ، دیکھو باتیں کرنے کے لیے ہمارے پاس پوری رات پڑی ہے اور ہمیں بھوک لگی ہے، کچھ کھائیں پئیں نہیں؟ تمہیں بھوک نہیں لگی؟ دیکھو تو ہم تمہارے لیے کیا کیا نعمتیں لائے ہیں: بکری اور چوزوں کا گوشت اور بینگن۔'' ''مگر پہلے خبریں اور پھر خوراک'' ''آلیکاس، تمہیں ہم پر بھروسہ نہیں؟ ہم نے تمہیں بہت دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیا تھا؟ اور اس سے تم گھبرا گئے، کیا تم چھوٹے بچے ہو؟ صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت تمہارے سر میں کیا سودا سما گیا ہے؟ یقیناً ہمیں گزشتہ رات واپس آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ عورتیں ___ وہ طوائفیں، انہوں نے ہماری ایک نہ چلنے دی ___ آج صبح میں چند منٹوں کے لیے یہاں آنا چاہتا تھا، لیکن بہت دیر ہو گئی تھی اور میں وقت پر آفس نہ پہنچ سکتا تھا۔'' اب تم نے پرڈیکارس (Perdicaris) سے مخاطب ہو کر کہا ''تمہیں بھی اپنے کام پر جانے میں دیر ہو رہی تھی؟ تم بھی کسی دفتر میں جاتے ہو؟'' ''نہیں آلیکاس، اس وقت یونیورسٹی میں میری کلاس تھی۔'' ''یونیورسٹی میں تمہاری کلاس دوپہر کے وقت بھی اور سہ پہر میں بھی؟'' ''آلیکاس، تم زیادتی پر اُتر آئے ہو، شک کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، میں سہ پہر بندرگاہ پر گیا تھا اور جہاز کے کیپٹن سے ملاقات کی۔'' ''کیا نام تھا جہاز کے کیپٹن کا؟'' ''آلیکاس میں سچ کہہ رہا ہوں کہ مجھے اُس کا نام اس وقت یاد نہیں، کوئی غیر یونانی نام تھا، جسے یاد رکھنا انتہائی مشکل تھا۔'' ڈیمٹروس (Demetrios) نے مداخلت کی ''وہ جاپانی تھا یا سویڈش'' ''مجھے یاد پڑتا ہے جیسے وہ کوئی سویڈش نام تھا'' ''اور بحری جہاز؟'' ''جہاز تو سویڈش ہی تھا، ٹھیک؟'' تم نے اُسے گردن سے پکڑ لیا ''لونڈے میرے ساتھ مسخریاں کرتے ہو؟'' اگر پیٹٹ ساس

مداخلت نہ کرتا تو تم اُس کا گلا ہی گھونٹ دیتے۔ ''شانت آلیکاس شانت ہو جاؤ مجھے علم ہے کہ تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہیں لیکن تم اس غریب اور مسکین لڑکے کو قربانی کا بکرا کیوں بنا رہے ہو، اگر تمہیں اتنا ہی جلال آیا ہے، تو یہ غصہ مجھ پر اُتار لو۔ میں نے ہی اُسے بندرگاہ پر بھیجا تھا، کیا تمہیں مجھ پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ میں تمہارا دوست ہوں اور عزیز بھی۔ کیا تمہیں وہ دن بھول گئے ہیں جب لڑکپن میں ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے؟'' تم نے اُسے ایک جانب دھکیلا ''میں جا رہا ہوں۔'' ''پاگل ہو گئے ہو؟ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟'' اور پرڈیکارس (Perdicaris) نے پُرسکون اور ہمدردانہ لہجے میں کہا ''نہیں آلیکاس، یوں نہیں، آپ ہمیں غلط سمجھے ہو۔'' دریں اثنا انہوں نے تمہارے ہاتھ پکڑ لیے، خوب لاڈ دلار کیا اور تمہیں گلے سے لگا کر پیار کیا۔ قصہ کوتاہ یہ کہ بالآخر تم مان گئے۔ ''ٹھیک ہے آؤ اس لذیذ خوراک سے انصاف کریں۔'' تم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ یہاں پر سفید وائن وافر مقدار میں موجود تھی، بالخصوص رٹسینا (Retsina) جو تمہیں بے حد پسند تھی اور تم نے تو قریب قریب ایک برس کسی قسم کی وائن کو چھو کر بھی نہ دیکھا تھا۔ تم نے جی بھر کر پی اور جلد ہی تمہارا طیش شگفتہ مزاجی میں بدل گیا اور زندہ دلی مدہوشی میں ڈھل گئی۔ ''ساتھیو، نوجوانوں، آؤ اب اُس بحری جہاز کا ذکر چلے کہ جو بدھ کو روانہ ہو رہا ہے۔ صبر ذرا صبر آلیکاس پیارے، ٹھہرو تو سہی، ہمارے پاس پینے کا بہت سامان پڑا ہے۔ تھوڑی دیر کے لے آرام نہ کر لیں۔'' ''ٹھیک ہے، بالکل درست ایک اور جام اور پھر کچھ آرام و نیند۔'' تم نے ایک جمائی لی اور آرام کرنے کے لیے پرڈیکارس (Perdicaris) کے کمرے میں کینیڈی برادران، کریملن اور ریڈ سکوائر کی تصویروں کے تلے بستر پر لیٹ گئے۔ بے شک وہ تمہارے ساتھی اور دوست تھے اور تم ایک دھدائک نیند میں ڈوب گئے۔ خواب میں ایک بار پھر تمہیں مچھلیاں دکھائی دیں تم موراکس (Morakis) کے ہمراہ کنارِ سمندر واقع اُسی سڑک پر تھے جہاں تم نے آمر کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ موراکس سمندری پشتہ کے درمیان میں کھڑا تھا اور تم پانی کے قریب ایک چٹان پر کھڑے تھے اور موراکس (Morakis) چلا چلا کر کہہ رہا تھا، آلیکاس چار آنکھیں دو سے کہیں بہتر ہوتی ہیں، پھر تم مجھ سے کیوں بچھڑے؟ پھر ایک موج نے دو مچھلیوں کو چٹان پر لا پٹکا۔ تم اُن دونوں کو پکڑنا چاہتے تھے، لیکن وہ زندہ تھیں اور اس قدر چکنی کہ جب بمشکل تم ان میں سے کسی ایک کو چھوتے تو وہ تیزی سے آگے نکل جاتی، ایک کو پکڑتے تو دوسری تمہیں جُل دے جاتی۔ تم دوسری مچھلی کی جانب جھکتے تو پہلی تمہارے ہاتھ سے پھسل جاتی۔ تم یہ سارا دُکھ اس لیے بھوگ رہے تھے کیونکہ تمہیں پتہ تھا کہ صرف ایک کو پکڑنا لاحاصل ہے۔ تمہارے لیے دونوں کو گرفت میں لانا از حد لازمی تھا۔ تم نے موراکس کو آواز دی ''موراکس ادھر آ کر میری مدد کرو۔'' لیکن موراکس نے تمہاری پکار نہ سُنی اور تم اُس چٹان سے گہرے پانی میں جا گرے اور ڈوبنے کے لمحات میں تمہیں محسوس ہوا، کہ موراکس (Morakis) تم سے بہت پہلے پانی میں گر چکا تھا۔ پیٹٹ ساس (Patitsas) تمہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔ ''آلیکاس تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا تم بیمار ہو؟ جو بستر پر یوں تڑپ تڑپ کر چلا رہے تھے۔'' ''میں نے ایک بھیانک سپنا دیکھا ہے۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے۔'' ''یہ سب وہم ہے تمہارا آلیکاس، چین سے سو جاؤ۔''

اگلی صبح منگل کا دن تھا اور ابھی تم محوِ خواب ہی تھے جب پیٹٹ ساس (Patitsas) باہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ''اوہو، ہم گزشتہ رات جہاز کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکے۔ خیر یہ سب اس مے نوشی کا کیا دھرا ہے۔ خیر میں تقریباً بارہ بجے دوپہر گھر واپس آ جاؤں گا اور تب اس موضوع پر بات چیت ہوگی۔ مجھے اس پر شدید ندامت ہے کیونکہ اس میں دیری تو ہوگی مگر میں مجبور ہوں اور مجھے ابھی باہر جانا ہے۔'' اس نے تمہیں یہ جواب دینے کا وقت بھی نہ دیا ''نہیں، لعنت بھیجو ہر شے پر، ہمیں ابھی اور اسی وقت بات کرنی ہے اور اس سے تمہارے اندر وہ بے چینی پھر سے عود کر آئی جسے سفید وائن نے معدوم کر دیا تھا، لیکن تم بہت کوشش کر کے اور خود پر جبر کرتے ہوئے اس کیفیت پر قابو پا لیا اور چند گھنٹوں کے بعد جب تم بیدار ہوئے تو تم پُر اعتماد تھے۔ تم نے سیٹی بجاتے ہوئے کافی بنائی اور پھر پورے اطمینان اور لطف کے ساتھ اُسے پیا۔ تم نے خبروں کے لیے ریڈیو لگایا اور فوراً ہی تمہاری بے چینی عود کر آئی۔ ریڈیو پر اناؤنسر کہہ رہا تھا کہ ابھی تک تمہارا اور موراکس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ بہرحال تلاش جاری ہے اور فوجی حکومت ایسے کسی بھی اطلاع دینے والے کو پانچ لاکھ یونانی دریچم انعام میں دے گی، اگر اس سے تمہیں گرفتار کیا جا سکے۔ لعنت ہو ان پر، پانچ لاکھ یونانی دریچم بہت بڑی رقم ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جو کسی بھی شخص کی اشتہا کو اور زیادہ بھڑکا سکتی ہے۔ تمہیں حد درجہ احتیاط سے کام لینا ہوگا اور جب پیٹٹ ساس (Patitsas) اور پرڈیکارس (Perdicaris) گھر میں موجود نہ ہوں تو ہر طرح کے شور شغب سے اجتناب کرنا ہوگا۔ تمہیں یہ روشنیاں گل کرنا ہوں گی اور ریڈیو کی آواز کو دھیما کرنا ہوگا وگرنہ ہمسایوں کو شک ہو سکتا ہے۔ پانچ لاکھ یونانی دریچم کیا اُن دونوں کو علم تھا کہ تمہارے سر کی قیمت پانچ لاکھ یونانی دریچم لگی تھی؟ تم نے پرڈیکارس کو جگایا ''ابے، کیا تجھے اس بات کا علم تھا کہ میری قیمت پانچ لاکھ یونانی دریچم لگی تھی؟'' پرڈیکارس (Perdicaris) بُڑبُڑایا، ''وہ گزشتہ کل سے اس طرح کے اعلانات کر رہے ہیں۔'' پھر اُس نے بستر پر ایک لوٹ لگائی اور اطمینان سے خراٹے بھرنے لگا۔ گزشتہ کل سے؟ یہ کیونکر ہوا اور اس سے اُس کا مطلب کیا تھا؟ اور انہوں نے اس سے پہلے تمہیں اس بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے؟ اور خود انہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی۔ یقیناً انہیں ریڈیو سے تو کسی طرح کا پتہ نہیں چل سکتا۔ تم نے ریڈیو کا کوئی نیوز بلیٹن سننا نہ چھوڑا تھا اور ریڈیو پر پہلی بار انہوں نے تمہاری گرفتاری میں مدد دینے پر انعام کا اعلان کیا تھا۔ خیر ممکن ہے، انہوں نے اخبار میں اس کے بارے میں پڑھا ہو، مگر نہیں اخبارات سوموار کو شائع نہیں ہوتے اگر یہ اعلان اخبارات میں شائع ہوا ہوتا، تو یوں اعلان اتوار کے اخبارات میں شائع ہوا ہوتا ___ اور تم دوبارہ پرڈیکارس کے پاس گئے: ''اولڑ کے! تمہیں انعامی رقم کے بارے میں کس نے خبر دی؟'' ''اوہ بابا، مجھے کچھ خبر نہیں، مجھے اس بارے میں مطلقاً کچھ یاد نہیں، میں نے ضرورت سے زیادہ ہی پی لی ہے، مجھے سونے دو، اور آخر اس بات سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔'' اس کی باتوں سے تمہیں سچائی اور مخلصی کی خوشبو آئی اور تم نے اُس پر یقین کر لیا۔ ''بہت ہوئی بداعتمادی، بہت کر لیا میں نے شک وشبہ اور تم نے خود سے سوال کیا، کیا تم نے اپنی رجائیت اور اُمید ترک کر دی تھی۔ کیا تمہیں صبر و استقلال کا مطلب فراموش ہو چکا تھا۔ تم ڈیمٹروس (Demetrois) کے

انتظار میں ایک بار پھر بستر پر دراز ہو گئے۔ اُس نے کہا تھا ''میں دوپہر کو لوٹ آؤں گا۔ ٹھیک بارہ بجے دوپہر تالے میں کنجی گھومنے کی آواز آئی۔ تم نے کہنیوں کے بل اپنے سر کو اوپر کیا ''ڈیمٹروس (Demetrois)؟ دھکم پیل اور پاؤں گھسٹنے کے شور کے ساتھ ایک کرسی الٹنے کی آواز آئی۔ سادہ لباس میں ہاتھوں میں ریوالور لیے تقریباً بیس فوجی اندر گھُس آئے، اور اُن سب کا نشانہ تمہاری طرف تھا۔ ''خبردار آلیکاس، کوئی حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا، اپنے ہاتھ اوپر کرو، ورنہ ہم تمہیں گولی مار دیں گے۔''

میں تمہاری اُن تصویروں کو دیکھ رہی ہوں، جو اُنہوں نے تمہیں گاوڈی (Goudi) کے فوجی کیمپ میں لے جانے سے پہلے کھینچیں۔ اُس سہ پہر انہوں نے تمہیں اخباری نمائندوں کے سامنے پیش کیا۔ تمہاری آنکھیں زمین پر گڑی تھیں۔ تمہارے سختی سے بند کیے گئے منہ سے دل توڑ دینے والی کڑواہٹ جھلک رہی تھی۔ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور تمہارے بازو اور ہاتھ ڈھیلے انداز میں لٹکے ہوئے جھول رہے تھے۔ تم شکست اور شرم ساری کی مکمل علامت تھے۔ اس شرمندگی کی وجہ یہ نہ تھی کہ تمہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا تھا بلکہ وزیرِ داخلہ کا پریس میں جاری کردہ یہ بیان تھا ''اُس کی اپنی تنظیم کے اراکین نے سرکاری انعام کی لالچ میں اُس سے غداری کی وہ تعداد میں دو ہیں اور اُن کے نام بالترتیب پیٹٹ ساس (Patitsas) اور پرڈیکارس (Perdicaris) ہیں۔'' اور پولیس انسپکٹر جنرل نے تم سے اور بھی بہت کچھ کہا، ''تمہارا خیال تھا کہ تمہیں دو جانثار اور تابع فرماں چاکر ملے ہوئے ہیں۔ کیوں؟ ہمیں تو اتوار سے ہی اس بات کی اطلاع تھی کہ تم اکاون، پٹیموس (Patmos) سٹریٹ میں چھپے ہوئے ہو۔ ہم نے وہاں فوراً چھاپہ اس لیے نہ مارا کہ پوری اُمید تھی کہ تم خود ہی تنگ آ کر گھر سے باہر نکل آؤ گے۔ دراصل ہم اپنے مخبر اور تمہارے کزن سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ہم تمہیں اُس کے گھر سے گرفتار نہ کریں گے۔ اُس نے ہمیں بتایا ''وہ پریشان ہے اور اُس کے اعصاب شل ہو چکے ہیں میں نے گھر میں اُس کے لیے خورد و نوش کے لیے بھی کچھ نہیں چھوڑا۔ وہ گھبرا کر خود ہی باہر آ جائے گا۔'' ''دو دن تک ہم نے تمہارا انتظار کیا اور اس دوران تمہاری ہر حرکت ہماری نگاہ میں تھی۔ پھر ہم اس کھیل سے تھک گئے اور تمہارے کزن اور اُس کے دوست کو ڈانٹ پلائی کہ یہ تم کس طرح کا کھیل کھیل رہے ہو، وہ بندی خانوں اور عقوبت خانوں کا عادی ہے، وہ تو اِس حالت میں بھی یہاں مہینوں قیام کر سکتا ہے۔'' لیکن اُس نے پھر اصرار کیا ''میں ایسے حالات پیدا کروں گا کہ وہ باہر آنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں اُسے بندرگاہ لے جانے کا جھانسا دوں گا۔'' ''ہم اِس روز روز کی بک جھک سے عاجز آ گئے اور اُسے حکم دیا کہ وہ ہمیں اپنے فلیٹ کی چابیاں لا دے۔ لیکن اُس کے لیے پانچ لاکھ یونانی دریچم کا انعام بھی کافی نہیں تھا۔ اب اُس نے اولمپک ایرویز میں ملازمت کا مطالبہ بھی داغ دیا۔ ہم نے اُسے اِس ملازمت کا پروانہ بھی فراہم کر دیا۔ ہم شریف اور محبِّ وطن لوگ ہیں، ہم تمہارے دوستوں اور ساتھیوں کی طرح بے وفا اور دروغ گو نہیں۔'' بعد ازاں اُس نے تمہیں بتایا کہ موراکس (Morakis) کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے اور وہ انتہائی سختی کے ساتھ تفتیش کر رہے ہیں اور وہ بھی اعترافِ جرم پر اعترافِ جرم کیے جا رہا ہے۔

غزلیات

احمد صغیر صدیقی

مقدّر رقص میں ہے دائروں میں رو رہے ہیں
ہمارے سب ستارے زائچوں میں رو رہے ہیں

بہت سے عکس ہیں اور سب کے ہونٹوں پر تبسم
کئی چہرے لیے ہم آئنوں میں رو رہے ہیں

حصارِ بام و در میں دفن ہیں سارے مُسافر
سفر سب خاک اوڑھے، راستوں میں رو رہے ہیں

وہ بے خوابی ہے اپنی، نیند بھی رکھتی ہے بیدار
وہ تنہائی ہے اپنی، محفلوں میں رو رہے ہیں

سنائیں کیا کسی کو شعر وہ عجزِ سخن ہے
یہ سب کے سب ردیفوں قافیوں میں رو رہے ہیں

خاور اعجاز

اُس کا نہ ملنا یونہی تو تقدیر میں نہیں
کوئی کڑی تو ہے کہ جو زنجیر میں نہیں

مایوس ہو رہا ہوں پسِ آرزوئے وصل
جو خواب تھا وہ خواب کی تعبیر میں نہیں

شب بھر اجالتے رہے جس کو بصد نیاز
وہ رنگ ہی تو صبح کی تصویر میں نہیں

اونچے کلس، سنہرے در و بام اور ستوں
اک شہر تھا جو اب کہیں تعمیر میں نہیں

جو کاٹ اس کی بات میں رنجش سے پہلے تھی
وہ زہر سے بجھے ہوئے اِس تیر میں نہیں

تھوڑا بہت ہے حیلہ و حکمت کے باب میں
باقی جو ہے احاطۂ تدبیر میں نہیں

☆☆☆

خاور اعجاز

مرے سرہانے کوئی جس طرح مہتاب رکھتا ہے
مجھے یہ خواب کافی دیر تک بے خواب رکھتا ہے

مرے چاروں طرف پھیلاتا ہے اُمید کی کرنیں
مجھے وہ روشنی کے کھوج میں بیتاب رکھتا ہے

گزرگاہیں بنا دیتا ہے جو منہ زور پانی میں
وہی بے آب صحرا میں سبیلِ آب رکھتا ہے

بریدہ شاخ میں کر دیتا ہے ذوقِ نمو پیدا
پھر اُس کے پھولنے پھلنے کے بھی اسباب رکھتا ہے

کبھی پانی پہ لکھ دیتا ہے وہ تہذیب مٹی کی
کبھی صحراؤں کی تقدیر زیرِ آب رکھتا ہے

لگا دیتا ہے ساحل سے سفینہ اور بعد اُس کے
کسی طوفاں کے آنے تک ہمیں غرقاب رکھتا ہے

خاور اعجاز

ہم تساہل کو بھی تدبیر سمجھ لیتے ہیں
چھت جو گر جائے تو تقدیر سمجھ لیتے ہیں

اتنے مانوس ہیں اس راہِ محبت سے کہ ہم
خواب سے پہلے ہی تعبیر سمجھ لیتے ہیں

ایک دھوکے پہ یقیں کرتے ہیں، یعنی ہر بار
منہدم ہونے کو تعمیر سمجھ لیتے ہیں

چار چھ غزلیں کہیں اور اِسی خوش فہمی میں
خود کو اس عہد کا ہم میرؔ سمجھ لیتے ہیں

بیٹھ جاتے ہیں کسی منظرِ فردا کے لیے
اور اِسے باعثِ تاخیر سمجھ لیتے ہیں

دیر ہو جاتی ہے رستے میں ہمیں یوں بھی کہ ہم
راہ گیروں کو عناں گیر سمجھ لیتے ہیں

☆☆☆

پرویز ساحرؔ

کہنے کو یوں تو سب کے لیے دِلبرا بھی ہو
لیکن شعور و عقل سے تم ماورا بھی ہو

اک عمر ہو گئی ہے اُسے دیکھتے ہوئے
لیکن حرام ہے کہ کبھی جی بھرا بھی ہو

ہر لحظہ اپنے آپ سے رہتی ہے میری جنگ
جیسے مِرے بدن میں کوئی دوسرا بھی ہو

مُدّت کے بعد آئنے میں خود کو دیکھ کر
ممکن ہے اپنے آپ سے قاتل ڈرا بھی ہو

اِن صدمہ ہائے ہجر سے مَرتا نہیں کوئی
ہاں ایک آدھ آدمی شاید مَرا بھی ہو

وہ شخص میرے صحن میں آئے بھی، جائے بھی
لیکن مجال ہے، کہیں آہٹ ذرا بھی ہو

اِس سادگیِ حُسن پہ قربان جایئے
وہ چاہتے ہیں، دوست بھی ہو اور کھرا بھی ہو

جنگل میں یُوں تو لاکھوں ہی طاؤس ہیں مگر
لازم نہیں کہ ہر کوئی نغمہ سَرا بھی ہو

ممکن نہیں کہ لَوٹ کے ساحرؔ وہ جا سکے
جس نے دیارِ عشق میں پاؤں دَھرا بھی ہو

☆☆☆

پرویز ساحرؔ

دہکتی آگ کے سانچے میں جیسے ڈھل گیا ہوں
مَیں تھوڑے وقت میں کتنا بدل بدل گیا ہوں

وہ شخص ایک حوالہ ہے میرے ماضی کا
مَیں اُس کے عشق سے آگے کہیں نکل گیا ہوں

سب اہلِ عشق کی حُرمت کا پاس رکھتے ہوئے
مَیں آج کوچۂ جاناں میں سَر کے بَل گیا ہوں

وہ اَجنبی کہ جسے تُم نے مُڑ کے دیکھا تھا
ہے سچ تو یہ کہ مَیں اُس اَجنبی سے جل گیا ہوں

اَب اِس سے بڑھ کے بھَلا اور ضبط کیا کرتا
مَیں اپنے سایے کو پیروں تلے کچل گیا ہوں

اگرچہ سب نے جڑیں کاٹنے کی کوشش کی
مگر مَیں پھر بھی زمانے میں پھُول پھَل گیا ہوں

ہمیشہ ایک دُعا نے مجھے سہارا دیا
مَیں گِرتے گرتے ہمیشہ سنبھل گیا ہوں

یہ اور بات کہ مَیں قتل ہو گیا ساحرؔ
جبینِ وقت پہ لیکن لہو تو مَل گیا ہوں

پرویز ساحرؔ

سانس روکے ہوئے آتا ہے، گزر جاتا ہے
روز کھڑکی میں وہ اِک پھُول بھی دَھر جاتا ہے

کوئی بھی شخص مگر روک نہیں سکتا اسے
وقت دیوار کے اندر سے گزر جاتا ہے

لوگ گولی کی بھی آواز سے گھبراتے نہیں
اور تُو غُنچہ چٹکنے سے بھی ڈر جاتا ہے

سَر بچاتا ہوں تو دستار نہیں بچتی مِری
اور دَستار بچاتا ہوں تو سَر جاتا ہے

بعض کو زہر سے بھی کچھ نہیں ہوتا ساحرؔ
اور کوئی تلخیِ اِحساس سے مَر جاتا ہے

پرویز ساحرؔ

دستِ چارہ گراں میں شفا کچھ تو ہو
اے خدا! میرے دُکھ کی دَوا کچھ تو ہو

یہ لہو سَرد ہی ہو نہ جائے کہیں
واقعہ ، سانحہ ، حادثہ کچھ تو ہو

مَیں سماعت کو بھی رِہن رکھ دوں مگر
اُس نے آہستگی سے کہا کچھ تو ہو

دُھند کے پار جانے سے ڈرتا نہیں
دُھند کے پار کا راستہ کچھ تو ہو

اِس قدر دُور مجھ سے تُو ساحرؔ نہ جا
رُوح سے جسم کا رابطہ کچھ تو ہو

☆☆☆

نوازش علی ندیم

حدِ نظر پہ ستارہ نما چراغ کی لو
بڑھا رہی ہے مرا حوصلہ چراغ کی لو

وفا کی زندہ روایت ہمارے خون میں ہے
ہمارا ورثہ ہے غم ، کربلا ، چراغ کی لو

کئی قرن سے اندھیروں سے جنگ ہے میری
کئی رتوں سے اثاثہ مرا چراغ کی لو

اُسے یہ کہنا تھا میرے قریب تر ہو جا
مرے لبوں سے یہ نکلا بڑھا چراغ کی لو

تری طلب بھی ہے حالات کا دباؤ بھی
لرزتی ہے سرِ بامِ ہوا چراغ کی لو

اندھیری راہ پر اذنِ سفر کے ساتھ ندیمؔ
لبوں سے میری جبیں پر سجا چراغ کی لو

نوازش علی ندیم

طلب کے بارے میں نکلے غلط قیاس مرے
پگھل گئے ہیں مری آنچ سے حواس مرے

ورق ورق میں بکھرتا تھا اُس کے ہاتھوں میں
سنا رہا تھا مجھی کو وہ اقتباس مرے

غمِ زمانہ بھی موجود ہے ، ترا غم بھی
نجانے پھر بھی ہیں کیوں روز و شب اداس مرے

مرے عدو پہ کھلی کیسے شخصیت میری
کہ جانتے ہیں مجھے دوست خاص خاص مرے

مجھے کچھ ایسے مری خواہشوں نے بانٹ لیا
مرے لیے کوئی لمحہ نہیں ہے پاس مرے

مرے حواس کی بیداریوں نے چھین لیے
ندیم خوابوں کے سب مرمریں لباس مرے

☆☆☆

نوازش علی ندیم

خوں میں حل ہو کے ہر اک سانس کو زنجیر کرے
کوئی لمحہ تو مری عمر کو تسخیر کرے

ربِ اظہار! وہی غم جو رگیں نوچتا ہے
میرے شعروں میں اُتر آئے مجھے میر کرے

ہاں وہی جس نے مجھے درد کا ادراک دیا
اب کوئی درد مرے واسطے اکسیر کرے

اور کیا جاگتی راتوں میں کرے آنکھ مری
قطرہ قطرہ نہ اگر درد کی تفسیر کرے

لکھنے والا خس و خاشاک لکھے خوابوں کو
خواہشِ زیست کو جب آگ سے تعبیر کرے

میں نے ہر سانس پہ سونپا ہے تصرف جس کو
کچھ دنوں کے لیے خود کو مری جاگیر کرے

اس کو مطلوب اگر مجھ میں سکونت ہے ندیمؔ
ریزہ ریزہ وہ سمیٹے مجھے تعمیر کرے

نوازش علی ندیم

تیرے ہونٹوں سے جب بیاں ہوا میں
نسل در نسل داستاں ہوا میں

کاشت کی ہے بدن میں درد کی فصل
غم کا موسم تھا جب جواں ہوا میں

میں سمجھتا ہوں میں سنور گیا ہوں
تم یہ کہتے ہو رائیگاں ہوا میں

تم نے کب مجھ پہ حکمرانی کی
تم سے تسخیر ہی کہاں ہوا میں

جانے کیا آنچ دی گئی مجھ کو
میں کہ فانی تھا جاوداں ہوا میں

دل میں جب تک طلب تھی تنہا تھا
ذکر کرتے ہی کارواں ہوا میں

جب زمیں پر جبیں رکھی میں نے
محرمِ ہفت آسماں ہوا میں

☆☆☆

ظفر اقبال بادؔر

آزما معجزے ہُنر کے بھی
کبھی ہم کو دکھا سنور کے بھی

گرد ، پتھر ، سبھی ضروری ہیں
چاہیے کچھ نشاں سفر کے بھی

ننگے پاؤں طواف ہم نے کیا
یُوں چنے خار رہ گذر کے بھی

کچھ بھی تیرے سِوا نہیں رَکھا
دیکھ دِل میں کبھی اُتر کے بھی

ہو یقیں مجھ کو اپنے ہونے کا
کبھی یُوں دیکھ آنکھ بھر کے بھی

زندگی کا ہُنر نہیں آیا
ڈٹ کے دیکھا ہے اور ڈر کے بھی

خون سے سینچتے تھے پودوں کو
اب چکھا ذائقے ثمر کے بھی

ہے بڑا وہ جسے بنائے رب
تُو برابر نہیں اُبھر کے بھی

ہے مصیبت مزاجِ شاہی بھی
خوش ہوا وہ ، اُداس کرکے بھی

کن ہواؤں میں جان رہتے ہو
پاس بیٹھو کبھی ظفؔر کے بھی

عطاء الرحمٰن قاضی

کچھ زمیں میں ہے کشش کچھ آسماں میں
میں الجھ کر رہ گیا ہوں درمیاں میں

شعلۂ جذبِ دروں نے کر دیا راکھ
ہم کہ بے حد مطمئن تھے سایباں میں

دیپ سا چمکا ہے کوئی طاقِ دل پر
یاد سی مہکی ہے کوئی قصرِ جاں میں

آنکھ الجھتی ہے بکھرتے منظروں سے
دل بھٹکتا ہے حصارِ رایگاں میں

وصل کے گم گشتہ لمحوں سے عطاؔ پھر
رنگ بھرنا ہے یہ بجھتی کہکشاں میں

راؤ وحید اسدؔ

ہوا جب ریت پر آہستگی سے سرسراتی ہے
تو خال و خد وہاں اپنے بنا کر چھوڑ جاتی ہے

شبِ غم کی فصیلوں سے میں باہر جھانکتا ہوں جب
تو دل کی سرحدوں سے یاد اُس کی سر اُٹھاتی ہے

کنارے کے کٹاؤ میں کوئی تو راز ہے ورنہ
کہاں دریا کی طغیانی بہاؤ لے کے آتی ہے

اگر کردار ہٹ جائیں وفا کے خاص رستوں سے
تو اکثر پھر محبت کی کہانی مَر ہی جاتی ہے

مجھے تقسیم کر ڈالا زمانے کی ضرورت نے
جو اپنی، اپنی مرضی سے میرے حصے بناتی ہے

اسلم سحابؔ ہاشمی

گھر اپنا میں نے چھوڑ دیا در بدر رہا
لیکن وہ کون تھا جو مرا ہمسفر رہا

یادوں کے سایہ دار شجر میری راہ میں
ایسے رہے کہ دربدری میں بھی گھر رہا

کس کی دعاؤں کا یہ اثر تھا کہ دشت میں
اک اَبر دھوپ میں بھی مِرا ہمسفر رہا

آنکھوں کی تیرگی میں تھی خوابوں کی روشنی
یادوں کی چاندنی میں کھلا دل کا در رہا

امکان کی بھی حد سے جو نکلا مگر سحابؔ
خوابوں کی وہ منڈیر پر آتا نظر رہا

☆☆☆

نظمیں

احمد صغیر صدیقی

جب داستان گو چپ ہوا

جب داستان گو چپ ہوا
جب سامعین سب اٹھ گئے
منظر گیا---بدلا آسماں

مجبوریاں، دل داریاں
جادو جگا کر سو گئیں
اک پل رہیں، پھر کھو گئیں
سب دوریاں، نزدیکیاں
تم ہو گئیں
یہ گھومتی بوڑھی زمیں
میں بن گیا
صدیوں پرانا آسماں

ڈاکٹر علی اطہر

شب خون

زہے قسمت
تبسم آفرینش آ گہی اُس کی اداؤں کی
شعارِ دل لگی کے مُرتعش ناسور میں کھو کر
اذیّت
خود اذیّت کی کرامت
بن کے اُتری تو
مرے دشتِ طلب میں
دہشتیں سارے وچھوڑوں کی
یوں نازل ہو گئیں جیسے
کسی پاگل جنونی کے
الم کی، یاسیت کی انتہا
شبخون کی صورت---

☆☆☆

ڈاکٹر علی اطہر

نئے مقدر کا سورج

چلو سورج تراشیں اِک نیا اپنے مقدّر کا
بڑا امکان غالب ہے
کہ ہم پہچان کھو بیٹھیں
شناسائی، مروّت، آشتی کے خواب منظر کی--
کہ اب تو ہر طرف
گہری قنوطی کیفیت ہے
آدمی نامعتبر آنکھوں کی زد میں
اور انساں ہولنا کی کے تحیر میں مقید ہے---
حصارِ عافیت بھی اب شکستہ ہے
فصیلِ خواب سے باہر
نجانے کس قدر سفّاک، وحشی اور پھٹی آنکھیں
سکوں، حفظ واماں کی تاک میں غارت گری کے
اسلحے سے لیس بیٹھی ہیں---
نہ اب شہروں میں شالیں چاہتوں کی تان کر
وہ مشترک بیٹھک رہی باقی
کہ جس میں چاشنی کے بول زندہ تھے---
نہ اب گوٹھوں میں باقی ہے
کسی پیپل کے نیچے
پیار کا پشمینہ اوڑھے سوندھی مٹی کا بنا ڈیرہ
جہاں کی شام اکثر
ہیر کی دلکش، مدھر تانوں میں ایسے سانس لیتی تھی
کہ جیسے بانسرہ کی خوبصورت چھاتیوں کے درمیاں
دھیمی، مسکن، لطف پرور زندگی دائم---
نہ وہ بیٹھک رہی باقی، نہ وہ پیپل کے ڈیرے ہیں
کہ اب شام کے دلکش دھندلکے سے بہت پہلے
مکانوں کے کواڑوں کی طرح سے
آنکھ اور دل کے کواڑوں کو بھی وا رکھنا حماقت ہے
مگر کب تک؟؟؟
ابھی کل آنے والی نسل کی آنکھیں
تجسّس سے
کسی مقتول کا خوں، راکھ خوابوں کی جو دیکھیں گی
تو پھر لکنت زدہ لہجے میں پوچھیں گی
یہ سب کیا ہے؟
تو کیا کہنا ہے؟؟ سوچا ہے؟؟
سنو اے فکر کے نایاب خلیوں کی وراثت کے امیں ذہنو!
ابھی بھی معجزہ ممکن ہے نسلوں کی تسلّی کا
کسی اچھے سے مستقبل کے صیغے کی ضمانت میں
رویوں کی روایت میں
محبت اب ضرورت ہے---
چلو سورج تراشیں اِک نیا اپنے مقدّر کا---

ڈاکٹر علی اطہر

اُچٹتی نیند کا نوحہ

اُچٹتی نیند کا نوحہ
سسکتی سسکیاں، سوچیں
کنارِ خواب جو زخمی محبت سانس لیتی ہے
اذیت ناک ہوتی ہے۔۔۔
بدن کی بالکونی پر
اُبھرتی عمر کی مُہلک لکیریں
ڈھونڈتی ہیں
دردِ زہ میں مبتلا ایسی زمینوں کو
جہاں سے پیار اُگنا تھا
مگر اب موت پھوٹی ہے۔۔۔
یہ آخر موت بھی کیا ہے؟
وہ اِک لمحہ؟
جو گم جائے کسی کی یاد میں تھک کر۔۔۔
صعوبت ہجر کی؟
آنسو کی پوجا؟
درد کی بیدرد کرچیں؟
گمشدہ یادیں؟
کہ جن کی خوشبوئیں مانوسیّت کے
منصبوں سے ماورا ٹھہریں۔۔۔
توجہ، چاہتی پارہ طمع آنکھوں کی کھو دینا۔۔۔
صلیبیں سوچ کی
دل میں بچھے سب راستوں پہ
خیمہ زن
معصومیت کو ورغلاتی ہوں
رقابت کے کسی گمنام منظر کی جھلک دے کر
کہ بستی خواب کی
سرگوشیوں سے سانحہ بن کر
کراہے چُپ تمنا میں۔۔۔
دریچہ حال میں ماضی کی ساری کلفتیں چُن لے۔۔
محبت واہموں اور وسوسوں کی
اُلجھنوں میں گم۔۔۔
یقیں مرنے لگے تو
درد ہونٹوں سے کبھی دُہرا کے دیکھو تو
اِسی کو موت کہتے ہیں۔۔۔
اُچٹتی نیند کا نوحہ
سسکتی سسکیاں، سوچیں
کنارِ خواب جو زخمی محبت سانس لیتی ہے
اذیّت ناک ہوتی ہے۔۔۔

☆☆☆

ڈاکٹر علی اطہر

مگر یہ کیسا عذاب دائم

یہ کرب کیا ہے؟
تمام عمروں کی نارسائی کا سلسلہ ہے
جو تشنگی کی تمام پوروں میں
اِک معلّق ہے استعارہ
کبھی نہ ملنے کا خوف، دہشت
کبھی ملن کے ادھورے لمحوں کا واہمہ ہے۔۔۔
یہ درد کیا ہے؟
یہ رائیگانی کی اِک کسک ہے
حلاوتوں کے فراق موسم کی سسکیوں میں
یا پھر
محبت کی پُرتپا کی کے یا لمحوں کی ہُوک کہ لو۔۔
یہ دُکھ؟
یہ دُکھ تو خوابوں کی سب بساطوں پہ
ڈھائی چالوں کا ایک مُہرہ
کہ جو نجانے کہاں کہاں پر
ہماری معصوم خواہشوں کو بھی مات دیدے۔۔۔
قرار؟
مُشکل
زمامِ وحشت کے بام و در میں۔۔۔
سکوں خرامی؟
وفا شعاری کے سب نصابوں سے کٹ گئی ہے۔
طلب تو ویسے بھی رتجگوں میں
ہے خود کلامی کا ایک چلّہ۔۔۔
تڑپ پرندہ سراب خواہش کے جنگلوں میں
اُسے پتا ہے
کہ مخلصی کا
تمام حاصل بھی مخمصہ ہے
مگر اُڑانوں میں مُنہمک ہے۔۔۔
یہ موت کیا ہے؟
فصیلِ خواب و خیال پر ہے
ٹھٹھرتی آنکھوں کا سرد، بے حس نظر کا
پہرا۔۔۔
یہ زندگی بھی عذاب لمحوں سے کم نہیں ہے
کمال یہ ہے
کہ ہم ازل ہیں
ابد بھی ہم ہیں
مگر یہ کیسا عذاب دائم؟؟؟

☆☆☆